سبط حسن
مارکس اور مشرق
ترتیب وتدوین
ڈاکٹر سید جعفر احمد
مارکس اور مشرق
سبط حسن
دانیال

مارکس اور مشرق

سبطِ حسن

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

دانیال

ترتیب

پہلا حصہ ــــ مارکس اور مشرق

دوسرا حصہ ــــ متفرق مضامین

عرضِ مرتّب

معروف ترقی پسند ادیب اور دانشور سید سبطِ حسن کا انتقال ۲۰ اپریل ۱۹۸۶ء کو ہوا۔ اپنے انتقال کے وقت وہ جن علمی منصوبوں پر کام کرنے میں منہمک تھے، 'مارکس اور مشرق' ان میں سرِ فہرست تھا۔ مشرقی ممالک کے حوالے سے کارل مارکس کی سوچ کیا تھی اور اُس کے افکار سے ان ممالک میں تہذیبی اور سیاسی سطح پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوئے، اِن امور کا تجزیہ کرنا سبطِ حسن صاحب کی دیرینہ خواہش تھی۔ اُن کی بے وقت وفات کی وجہ سے 'مارکس اور مشرق' کی تصنیف کا کام مکمل نہیں ہو سکا۔ تاہم اس کتاب کے جتنے ابواب سبط صاحب مکمل کر چکے تھے اُن کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اِن میں کتاب کے موضوع کا بڑی حد تک احاطہ ہو گیا تھا۔ زندگی اگر انہیں مہلت دیتی تو شاید وہ اس میں ایک آدھ باب ہی کا مزید اضافہ کر سکتے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ وہ لکھے گئے ابواب پر نظرِ ثانی میں بھی کچھ وقت صرف کرنا چاہتے کیونکہ یہی اُن کا تصنیف و تالیف کا انداز تھا کہ وہ کسی مسودے کے پریس میں جانے کے وقت تک اس کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف رہتے تھے۔ کتاب کا وہ حصہ جو میرے اندازے کے مطابق لکھا جانا باقی تھا وہ روسی انقلاب اور مسلم دنیا پر اس کے اثرات سے متعلق تھا اور میں اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر یہ کہنے کی پوزیشن میں ہوں کہ سبطِ حسن صاحب نے اس حصے کے لیے بہت سا مواد اکٹھا کر لیا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے لندن کی انڈیا آفس لائبریری سے بہت سی دستاویزات اور مضامین کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں حاصل کی تھیں اور مختلف مسلم ملکوں سے وہاں کی اشتراکی تنظیموں کا لٹریچر حاصل کرنے کے لیے بھی بڑی تگ و دو کی تھی۔ اس آخری حصے کے لیے انہوں نے بیسیوں صفحات پر مشتمل نوٹس بھی تیار کیے تھے۔ افسوس یہ سب چیزیں کسی باب کی شکل میں ضبطِ تحریر میں نہیں آ سکیں۔

پیشِ نظر کتاب کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے اس طرف اشارہ کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ سبطِ حسن صاحب کی علمی مصروفیات اور ان کا تصنیف و تالیف کا کام بڑا متنوع اور ہمہ گیر ہوتا تھا۔ وہ عموماً بیک وقت ایک سے زیادہ کتابوں اور مضامین پر کام کر رہے ہوتے تھے۔ چنانچہ اکثر یہ صورت ہوتی تھی کہ ایک کتاب کے آخری پروف پڑھے جا رہے ہیں جبکہ دوسری کتاب کا پہلا مسودہ تیار ہو رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کسی اخبار یا جریدے کے تقاضے پر اس کے لیے مضمون بھی لکھا جا رہا ہے۔ سبطِ صاحب کی زندگی میں اُن کی جو آخری کتاب شائع ہوئی وہ 'نویدِ فکر' تھی جبکہ انگریزی کتاب *The Battle of Ideas in Pakistan* کو وہ انتقال سے کچھ ہی روز پہلے اشاعت کے لیے پریس کے سپرد کر چکے تھے۔ ان دونوں کتابوں کو مکمل کرنے کے بعد وہ فوری طور پر 'مارکس اور مشرق' کی تصنیف میں مشغول ہو گئے تھے۔ مگر ۱۹۸۴ء میں فیض احمد فیض کے انتقال کے نتیجے میں سبطِ صاحب کا یہ منصوبہ کچھ عرصے کے لیے معطل ہو گیا۔ فیض صاحب سے ان کے دیرینہ نظریاتی اور ذاتی تعلقات تھے اور اس حوالے سے یادوں کا ایک زبردست خزینہ تھا جو ان کے نہاں خانۂ ذہن میں محفوظ تھا۔ فیض صاحب کے انتقال پر سبطِ صاحب کو یہ خیال آیا کہ انہیں ان سب یادوں کو، خاص طور سے فیض کی مختلف غزلوں اور نظموں کی وجہِ نزول کے بارے میں جو کچھ ان کے علم میں تھا، اُس کو ضبطِ تحریر میں لے آنا چاہیے۔ سو انہوں نے فیض صاحب پر بھی ایک کتاب لکھنے کا منصوبہ بنا لیا اور پھر اگلے کئی ماہ اس کتاب نے اُن کو مصروف رکھا۔ سبطِ صاحب کے انتقال کے وقت تک یہ کتاب مکمل نہیں ہوئی تھی لیکن اس پر اتنا کام ضرور ہو چکا تھا کہ اس کو احتیاط کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا جا سکتا تھا۔ یہ خدمت مرحوم حسن عابدی صاحب نے انجام دی اور وہ کتاب 'سخن در سخن' کے نام سے شائع ہوئی۔ فیض احمد فیض پر سبطِ صاحب کی یہ تصنیف مطالعۂ فیض اور فیض شناسی کے حوالے سے ایک ناگزیر کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

سبطِ حسن صاحب ہمارے ملک کے ایک مستند اشتراکی مفکر اور ادیب تھے۔ انہوں نے اپنی تمام تر شعوری زندگی اشتراکی فکر سے بہتر سے بہتر آگاہی حاصل کرنے، اس فکر کے فروغ اور ترویج کے لیے صرف کی۔ وہ ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے بھی ایک عرصہ فعال رہے۔ عملی سیاسی کام کے دوران بھی ان کا مطمحِ نظر استحصال اور طبقاتی تفریق سے پاک ایک عادلانہ انسانی معاشرے کا قیام تھا۔ وہ غیر منقسم ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوئے اور قیامِ پاکستان

کے بعد نوزائیدہ مملکت میں انہوں نے یہاں کی کیمونسٹ پارٹی میں اہم ذمہ داریاں سرانجام دیں۔ خاص طور سے ابتدائی برسوں میں پارٹی کے جرائد اور کتابچوں کی ترتیب و تالیف کا کام بڑی حد تک انہی کے سپرد رہا۔

اشتراکیت سے خود سبط حسن صاحب کا اپنا تعارف غیر منقسم ہندوستان میں طالبعلمی کے زمانے میں ہوا تھا۔ اس حوالے سے اپنی کتاب 'موسیٰ سے مارکس تک' کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> 'سوشلزم کے ابتدائی اصول میں نے مشہور انقلابی مؤرخ ڈاکٹر محمد اشرف مرحوم سے سیکھے تھے۔ یہ اُن دنوں کا قصہ ہے جب ملک پر انگریزوں کی عملداری تھی اور اشتراکی لٹریچر کا داخلہ بالکل ممنوع تھا۔ کبھی کبھی کارل مارکس، اینگلز یا لینن کی کوئی کتاب چوری چھپے آجاتی تو اس کی سائیکلوسٹائل نقلیں خفیہ طور پر گشت کرتیں مگر ہم لوگوں کی رسائی ان دستاویزوں تک نہ تھی۔ بس لے دے کر برٹرنڈ رسل، برنارڈ شا، ڈی۔ایچ۔کول یا سڈنی ہک کی تصنیفات پڑھنے کو ملتیں حالانکہ ان میں سے کوئی بھی حقیقی معنی میں سوشلسٹ نہ تھا۔'[1]

سوشلزم کے ابتدائی اصولوں سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد سبط حسن صاحب نے اشتراکیت کے بارے میں غور و خوض اور مطالعے کو ہمیشہ جاری رکھا۔ مارکسزم کی تفہیم حاصل کرنے کے ضمن میں سبط حسن صاحب کو ایک عمدہ موقع اس وقت ملا جب وہ تقسیم ہند سے ذرا قبل ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی کے جرائد، خاص طور سے اس کے انگریزی جریدے 'نیو ایج' کے نامہ نگار کی حیثیت سے کچھ عرصے کے لیے امریکہ میں مقیم ہوئے۔ یہاں انہوں نے مختلف لائبریریوں میں مارکس کی ان تحریروں تک رسائی حاصل کی جو ابھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئی تھیں۔ مثلاً انہوں نے 'نیویارک ٹری بیون' میں چھپنے والے مارکس کے ان مراسلوں کا مطالعہ کیا جو ہندوستان کے حالات کے بارے میں اور خاص طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے تناظر میں مارکس نے

۱۔ سبط حسن، 'موسیٰ سے مارکس تک' (کراچی: مکتبۂ دانیال، بارھواں ایڈیشن، ۲۰۰۶ء)، ص۔ ۷

لندن سے لکھ کر بھیجے تھے۔ سبط حسن صاحب نے نہ صرف یہ کہ ان مضامین کا مطالعہ کیا بلکہ ان کو ٹائپ کروا کر (فوٹو اسٹیٹ کا تو ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں دُور دُور تک کوئی تصور نہیں تھا) اپنے پاس محفوظ بھی کر لیا۔[۲]

مارکس کی تحریروں کو ٹائپ کی صورت میں محفوظ کر لینے کی سبط حسن صاحب کی یہ مشق شاید ابھی اور آگے جاتی مگر ۱۹۴۸ میں ان کو بائیں بازو کے اُن کے نظریات اور سرگرمیوں کی پاداش میں امریکہ بدر کر دیا گیا۔ اس واقعے سے قطع نظر مارکسزم کے مطالعے کا شوق اُن میں ہمیشہ برقرار رہا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی فکر میں گہرائی اور پختگی آتی چلی گئی اور ان میں یہ اہلیت بھی پیدا ہوتی چلی گئی کہ وسیع تر تاریخِ افکار و علوم کے تناظر میں اشتراکیت کے منفرد مقام اور کردار کے بارے میں اعتماد کے ساتھ گفتگو کر سکیں۔

'مارکس اور مشرق' سے قبل سبط حسن صاحب اشتراکیت کے موضوع پر اور بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ ان تحریروں نے ایک اشتراکی مفکر کی حیثیت سے اُن کو ایک پہچان فراہم کرنے اور اردو زبان میں اشتراکیت کے بارے میں لکھنے والوں میں ان کی ایک مسلّمہ حیثیت متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے اشتراکی فکر کی مبادیات اور اس کے اصولوں، نیز اشتراکی افکار کے ارتقا کے موضوعات پر اردو میں جو بیش بہا کتابیں اور مضامین تحریر کیے وہ سماجی علوم سے متعلق ہمارے ادب کا ایک قیمتی حصہ ہیں۔ سبط حسن صاحب کی تحریریں اس لحاظ سے اور بھی اہمیت کی حامل قرار پاتی ہیں کہ وہ سوشلزم کے بارے میں گفتگو کرتے وقت خالص علمی اور سنجیدہ انداز برقرار رکھتے ہیں۔ ان کا طرزِ استدلال سائنسی اور تاریخی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں کے اثرات کہیں زیادہ گہرے اور دور رس ثابت ہوتے ہیں۔

اشتراکیت کے موضوع پر سبط حسن صاحب کی تحریریں مختلف مواقع پر اور مختلف زاویوں سے لکھی گئیں۔ مثلاً انہوں نے ۱۹۷۰ء میں 'سوشلزم' کے نام سے فریڈرک اینگلز کی کتاب

۲۔ خوش قسمتی سے اس ٹائپ شدہ مسودے کی ایک کاپی جس پر سبط حسن صاحب کے دستخط بھی موجود ہیں راقم السطور کے پاس محفوظ ہے اور جلد ہی اس کو 'سبط حسن پیپرز' کے حصے کے طور پر پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی میں محفوظ کر دیا جائے گا۔

کا ترجمہ کیا۔ اس کتاب کو پیپلز پبلشنگ ہاؤس لاہور نے شائع کیا۔ ہفت روزہ 'لیل ونہار' کے دورِ ثانی (۱۹۷۱۔۱۹۷۰ء) میں انہوں نے سوشلزم کے بارے میں دو تین بہت اہم اور فکر انگیز مضامین تحریر کیے۔ بعد ازاں 'موسی سے مارکس تک' کے نام سے انہوں نے ایک مبسوط کتاب تحریر کی جس میں اشتراکی افکار کے عہد بہ عہد ارتقا کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا۔ یہ تو وہ تحریریں تھیں جن میں انہوں نے براہِ راست اشتراکیت ہی کو موضوعِ گفتگو بنایا تھا لیکن اپنی دوسری کتابوں میں بھی خواہ اُن کا موضوع کچھ بھی رہا ہو، انہوں نے اشتراکی تصورِ تاریخ اور مارکسی طرزِ مطالعہ ہی کو برتنے کا اہتمام کیا۔ مثلاً 'ماضی کے مزار' میں انہوں نے قدیم تہذیبوں کے نظامِ فکر واحساس، اُن کے اساطیر اور اقدار کو تاریخی مادّیت کے اصولِ نقد پر پرکھنے اور ان کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی۔ 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا' میں انہوں نے برصغیر کے عہدِ قدیم سے سلطنتِ مغلیہ کے زوال تک کے ادوار کا احاطہ کیا اور یہاں بھی تاریخ نویسی کی اُس روش سے اجتناب کیا جس کی رُو سے کسی ملک یا خطے کی تاریخ کو وہاں کے حکمران خاندانوں کے عروج وزوال کی تفصیلات کے بیان تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس سبطِ حسن صاحب نے مارکسی طرزِ فکر وتحقیق کو بروئے کار لاتے ہوئے برصغیر کی تاریخ کو یہاں کے مادّی عوامل، ذرائع پیداوار اور سماجی رشتوں کے تناظر میں بیان کرنے کی کوشش کی۔ اس کتاب میں برصغیر میں انگریز کی آمد سے قبل پائے جانے والے سماجی جمود کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے وہ براہِ راست برصغیر کی بابت مارکس کے تجزیوں سے اکتساب کرتے ہیں اور ایشیائی طرزِ پیداوار کو، جس کی رُو سے زمین پر نجی ملکیت کی گنجائش موجود نہیں تھی اور زمین ریاست کی ملکیت ہوتی تھی، اُس خود کفالت کا ذریعہ سمجھتے تھے جس کے ہوتے ہوئے معاشرے میں نئے راستے اور نئی راہیں تلاش کرنے اور موجود پیداواری نظام کو توڑنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ مارکس کے اس تجزیے سے بہت سے مارکسیوں نے بھی سو فیصد اتفاق نہیں کیا ہے لیکن سبطِ حسن صاحب اس موضوع پر مارکس کے نقطۂ نظر کو مکمل طور پر قبول کرتے ہیں اور اسی کو مستند تصور کرتے ہیں۔

'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۰ء کے عشرے کے وسط میں شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے چھپتے ہی ہندوستان میں انگریز کی آمد سے قبل کے سماجی در وبست اور ہندوستانی معاشرے کے جمود کے بارے میں گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ مارکس کے تتبع میں سبط

حسن صاحب کا کہنا یہی تھا کہ ہندوستان میں صدیوں سے جو ایک خود کفیل معاشرت قائم تھی اس نے یہاں ایک ایسے جمود کو برقرار رکھا جو انگریز کی آمد پر ہی ٹوٹنا شروع ہوا۔ مارکس اس کو تاریخ کا ایک ایسا موڑ قرار دیتا ہے کہ جہاں انگریزی استعمار کے شر میں سے خیر کا ایک پہلو اُجاگر ہوا۔ اس نقطۂ نظر سے کامل طور سے اتفاق نہ کرنے والے اہلِ دانش میں خود مارکسی علمی روایت سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی شامل ہیں۔ مغربی دنیا میں اور انگریزی زبان میں یہ بحث ومباحثہ برسہا برس سے چلا آرہا ہے لیکن ہمارے یہاں اس کا آغاز سبطِ حسن صاحب کی مذکورہ کتاب کی اشاعت کے بعد شروع ہوا اور اس موضوع پر خاص طور سے صفدر میر (زینو)، محمد علی صدیقی اور کئی دوسرے دانش ور اظہارِ خیال کرتے رہے۔ خود سبطِ حسن صاحب نے بھی پاکستان اور پاکستان سے باہر بہت سے دانشوروں سے تحریری سطح پر مکالمہ کیا۔ ان لوگوں میں خاص طور سے پروفیسر حمزہ علوی (جو اُن دنوں برطانیہ کی مانچسٹر یونیورسٹی سے وابستہ تھے) اور پروفیسر اعجاز احمد (امریکہ) شامل ہیں۔ یہ انہی مباحثوں اور مکالموں کے دوران ہوا کہ سبطِ حسن صاحب نے مارکس اور مشرق کے موضوع پر زیادہ تفصیل کے ساتھ اور مزید تحقیق کر کے ایک مبسوط کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کتاب میں وہ صرف ایشیائی طریقۂ پیداوار اور ہندوستان میں انگریزی استعمار کے قیام سے قبل اور اس کے بعد کے سماجی نظام ہی کے بارے میں لکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ مشرق، اور خاص طور سے مسلم ممالک پر اشتراکیت کے فکری اور سیاسی اثرات کا بھی احاطہ کرنا چاہتے تھے۔ ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب نے ایک دنیا پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ غلام ملکوں میں آزادی کی تحریکیں اُٹھیں اور سماجی انصاف کے حصول کے لیے کوششیں کرنے والوں کو ایک طرح کا حوصلہ ملا اور اُن میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء کے بعد دنیا بھر میں انقلابی تحریکوں اور آزادی کے لیے جدوجہد کا دور دورہ ہوا۔ انہی برسوں میں مسلم دنیا میں صدیوں کے جمود کو چیلنج کرنے والی آوازیں اُٹھنا شروع ہوئیں اور ان ملکوں کی مادّی اور اخلاقی پسماندگی کے بطن ہی سے سماجی تبدیلی اور بیداری کے شعور نے جنم لیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آزادی اور انصاف کے نعرے مسلم دنیا کے مختلف خطوں میں سنائی دینے لگے۔ شرقِ اوسط میں عرب قومیت کا پرچم بلند ہوا۔ افریقی ملکوں میں فرانسیسی استعمار کی غلامی کا طوق اُتارنے کا ولولہ پیدا ہوا، انڈونیشیا نے ولندیزیوں کے خلاف پنجہ آزمائی کا فیصلہ کیا اور خود جنوبی ایشیا میں انگریزی استعمار کے خلاف انقلابی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ ایک ایسا

دور ہے جس پر بہت تحقیق کی گنجائش ہے مگر بدقسمتی سے اس موضوع پر بہت کم کام ہوا ہے، خاص طور سے اردو زبان میں تو یہ موضوع تقریباً چھوا ہی نہیں گیا۔ سبط حسن صاحب کی یہ کتاب اس موضوع کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

بے جا نہ ہوگا اگر یہاں میں اس کتاب کے مشمولات کی تقسیم کی بھی وضاحت کر دوں۔ جیسا کہ قارئین دیکھیں گے کہ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں 'مارکس اور مشرق' کے وہ جملہ ابواب یکجا کر دیئے گئے ہیں جو سبط حسن صاحب نے اس کتاب کے لیے لکھے تھے۔ دوسرے حصے میں مارکس سے متعلق سبط حسن صاحب کی بعض منتشر تحریریں اکٹھا کر دی گئی ہیں۔ ان میں ایک تو مارکس کے بارے میں اُن کا وہ مضمون ہے جو انہوں نے مارکس کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر شائع ہونے والے ایک کتابچے کے لیے لکھا تھا۔ یہ کتابچہ مکتبۂ دانیال ہی نے شائع کیا تھا۔ اسی کتابچے میں ہندوستان کی تین جلیل القدر ہستیوں مولوی برکت اللہ بھوپالی، مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا حسرت موہانی کے بارے میں بھی مختصر مضمون اور اُن تینوں شخصیات کے افکار و خیالات کا تعارف پیش کیا گیا تھا۔ زیر نظر کتاب کے موضوع سے ان کے تعلق کے پیشِ نظر ان تینوں مختصر مضامین کو بھی شاملِ اشاعت کر لیا گیا ہے۔ سبطِ حسن صاحب کے دو مضامین 'سوشلزم کچھ خیالی، کچھ حقیقی' (دو قسطیں) اور 'کیا سوشلزم بیرونی نظریہ ہے؟' بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ یہ دونوں مضامین ہفت روزہ 'لیل و نہار' میں ۱۹۷۰ء کی مختلف اشاعتوں میں شائع ہوئے۔ اِن مضامین کے ساتھ ان شماروں کی تاریخ بھی درج کر دی گئی ہے جن میں ان کی اشاعت ہوئی۔ کتاب کے آخر میں سبط حسن صاحب کا ایک بہت پرانا مضمون 'اسلامی ممالک کی آزادی اور سوویت روس' شامل ہے۔ یہ مضمون غیر منقسم ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان ہفت روزہ 'قومی جنگ' (جس کے شعبۂ ادارت میں سبطِ حسن صاحب بھی شامل تھے) میں ۱۸/اپریل ۱۹۴۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ آج سے چھیاسٹھ سال پہلے کے اس مضمون کو اُس دور کے تناظر ہی میں پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اس مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ انقلابِ روس کے بعد سوویت یونین کے حوالے سے کس قدر امیدیں اور توقعات اُس دور کے انقلابی عناصر نے وابستہ کی تھیں۔ یہ مضمون ایک نادر تاریخی دستاویز ہے جس کی فراہمی کے لیے میں برادرم احمد سلیم کا ممنون ہوں۔

یہاں میں اس کتاب کی تدوین کے حوالے سے ایک دو مسائل کی طرف بھی قارئین کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں اور ایسا کرتے وقت میرا مقصد ان مسائل کو حل کرنے کے لیے جو طریقہ میں نے اختیار کیا ہے اُس کے بارے میں پڑھنے والوں کو اعتماد میں لینا ہے۔ زیرِ نظر کتاب سبطِ حسن صاحب کی چوتھی کتاب ہے جس کو مرتب کرنے کا اعزاز مجھے حاصل ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے ان کی تین دیگر کتابیں جو میں نے مرتب کیں وہ 'افکارِ تازہ' (۱۹۸۸ء) 'ادب اور روشن خیالی' (۱۹۹۰ء) اور 'مغنیِ آتش نفس۔۔۔ سجاد ظہیر' (۲۰۰۵ء) تھیں۔ ان کے علاوہ سبطِ حسن صاحب کی کم وبیش تمام کتابوں کے پچھلے چند برسوں میں جو نئے ایڈیشن مکتبۂ دانیال سے شائع ہوئے ہیں اُن کے لیے ایک طرف تو یہ اہتمام کیا گیا کہ ان کتابوں کو ازسرِ نو کمپوز کر کے شائع کیا گیا، دوسرے یہ کہ ان کے حوالہ جات اور حواشی کو بھی جدید اصولِ تحقیق کے مطابق مرتب کیا گیا اور میرے لیے یہ بات اعزاز کا باعث ہے کہ یہ خدمت سرانجام دینے کا موقع مجھے حاصل ہوا۔ اس تناظر میں یہ بھی عرض کروں گا کہ سبطِ حسن صاحب کی تحریروں کی ترتیب وتدوین میں یہ چیلنج درپیش ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان کے مسودات میں حوالہ جات مکمل طور پر موجود نہیں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ لکھتے وقت وہ حوالے کی کتاب کا نام یا مصنف کا نام اور صفحہ نمبر تو اپنی یادداشت کے لیے ضرور درج کر لیتے تھے لیکن اپنے خیالات کی رو کو ٹوٹنے نہ دینے اور تحریروں کی روانی کو متاثر نہ ہونے دینے کے پیشِ نظر وہ اس کتاب کا مکمل حوالہ لکھنے سے گریز کر لیتے تھے۔ ایسے نامکمل حوالوں پر بعد میں اگر ان کی نظر چلی جاتی تو وہ ان کو مکمل بھی کر لیتے تھے لیکن بعض اوقات یہ حوالے مکمل ہونے سے رہ بھی جاتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ہمیں اپنی علمی وادبی تاریخ میں ایسے بہت سے علماء اور فضلا نظر آتے ہیں جن کی تحریریں اپنے تبحر اور اپنی گہرائی وگیرائی کے حوالے سے بجا طور پر قدر ومنزلت کے مقام پر فائز ہیں مگر ان میں سے بہت سوں کے یہاں حوالہ جات اور حواشی کے لیے کسی باقاعدہ طریقۂ کار اور اسلوب یا رسمیات کے التزام کا رجحان نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ شاید صرف اتنی ہے کہ اس زمانے میں تحقیق کے ان پیشہ ورانہ اور تیکنیکی پہلوؤں سے ہماری علمی دنیا زیادہ متعارف نہیں ہوئی تھی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے بہت سے اہلِ فکر ودانش تحقیق کی باقاعدہ تربیت کے بجائے ذاتی شوق اور محنت کے وسیلے سے سنجیدہ تحریروں اور تصنیف وتالیف کی دنیا میں آئے۔ سبطِ حسن صاحب کی تحریروں کے مدوّن کی حیثیت سے میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی

ہے کہ ان کے حوالہ جات کو مرتب کرتے وقت ان میں یکسانیت کو پیش نظر رکھوں۔ نیز نامکمل حوالوں کو جہاں تک ممکن ہو سکے مکمل کرنے کی کوشش کروں۔ اس سلسلے میں مجھے بعض اوقات ان اصل کتابوں کو تلاش کرنے اور ان میں متعلقہ حوالوں کو ڈھونڈنے میں خاصا وقت بھی لگا ہے۔ لیکن یہ ساری مشق میرے لیے ہمیشہ دلچسپی اور کچھ نہ کچھ سیکھنے کا موجب ثابت ہوئی ہے۔ البتہ کبھی کبھار ایسا بھی ہوا کہ مجھے ان موقعوں پر ہتھیار ڈالنے پڑے جب باوجود پیہم کوشش کے میں کسی حوالے کو مکمل کرنے میں ناکام رہا۔ ایسے موقعوں پر میں قارئین سے معذرت ہی طلب کر سکتا ہوں۔ زیرِ نظر کتاب میں بھی میں نے کوشش کی ہے کہ حوالہ جات میں یکسانیت قائم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو مکمل طور پر درج کر سکوں لیکن جہاں میں ایسا نہیں کر سکا وہاں میں کتاب کے پڑھنے والوں سے معذرت چاہوں گا۔

آخر میں اس کتاب کی اشاعت کے مختلف مراحل میں جن دوستوں کا تعاون مجھے حاصل رہا ان کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ سبطِ حسن صاحب کی بیٹی نوشابہ زبیری کی ہمت افزائی اور شفقت مجھے ہمیشہ حاصل رہی۔ اُن کا شکریہ مجھ پر واجب ہے۔ مکتبۂ دانیال کی حوری نورانی صاحبہ سبطِ حسن صاحب کی تحریروں کی اشاعت میں جس دلچسپی کا مظاہرہ کرتی ہیں وہ بھی قابلِ تحسین ہے۔ آخر میں قارئین سے میری درخواست ہے کہ اگر اس کتاب کی ترتیب وتدوین میں کوئی نقص اُن کو نظر آئے یا اس کو بہتر بنانے کی کوئی تجویز اُن کے پاس ہو تو مجھے اس سے ضرور مطلع کریں تاکہ اگلے ایڈیشن میں ان چیزوں کو پیش نظر رکھا جا سکے۔

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

۵/جنوری ۲۰۰۹ء
کراچی

پہلا حصّہ

مارکس اور مشرق

پہلا باب

مشرق اور مغرب کے تعلقات

مشرقی ممالک سکندرِ اعظم (۳۵۶۔۳۲۳ق۔م) کے وقت ہی سے مغربی طاقتوں کی حرص و ہوس کی آماجگاہ رہے ہیں۔ ہر چند کہ سکندر وادیٔ سندھ میں اپنے قدم نہ جما سکا اور ناکام واپس گیا لیکن اس کے جانشین مشرقِ وسطیٰ اور مصر پر صدیوں تک قابض رہے۔ سکندر کی اچانک وفات پر جب یونانی جنرلوں کے مابین اقتدار کی جنگ چھڑی اور بالآخر سلطنت کا بٹوارہ ہوا تو مصر، بطلیموس (۳۰۴۔۲۸۳ق۔م) کو ملا اور مغربی ایشیا کا وسیع و عریض علاقہ سلوکس (۳۸۰۔۳۱۲ق۔م) کے حصے میں آیا۔ شام، لبنان، فلسطین، عراق اور ایران سب اس کی قلمرو میں شامل تھے۔ بطلیموس کا دارالسلطنت اسکندریہ تھا جس کو سکندر نے آباد کیا تھا اور سلوکس کا انطاکیہ تھا (جنوبی ترکی) جو جلد ہی ترقی کر کے نہایت اہم تجارتی مرکز بن گیا۔ مگر سلوکس کا زیادہ تر قیام اپنے آباد کردہ شہر سلوکیہ میں رہتا تھا جو موجودہ بغداد کے جنوب میں اس مقام پر واقع تھا جہاں دجلہ و فرات میں فقط چند میل کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ سلوکیوں کے دور میں اس شہر نے اپنی جائے وقوع کی وجہ سے بڑی شہرت پائی۔ یہی وہ شہر تھا جس کے ملبوں پر ساسانیوں نے اپنے قصر و ایوان تعمیر کیے اور عربوں نے اس کو مدائن سے تعبیر کیا۔

سلوکیہ کی تاریخ کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ سلوکس چہارم کی موت (۱۶۹ق۔م) کے بعد جب سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور جگہ جگہ خود مختار بادشاہتیں وجود میں آئیں تو دوسری ریاستوں کے برعکس سلوکیہ میں ری پبلک قائم ہو گئی۔ اس نے مقدونیہ کے بجائے ایتھنز کی تقلید کی۔ اس چھوٹی سی شہری ریاست میں جس کی آبادی چھ لاکھ سے زیادہ نہ تھی نظم و نسق کے تمام اختیارات ۳۰۰/ارکان کی سینٹ کو حاصل تھے[1] ملوکیت کے نرغے میں گھری ہوئی یہ ری پبلک تقریباً سوا تین

سوسال تک یونانی تہذیب اور یونانی علوم وفنون کی نمائندگی کرتی رہی۔ تب پہلے رومہ کے حملوں نے اس کو تاخت وتاراج کیا پھر شاپور نے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔

خاندانِ سلوکس کے زوال کے بعد یونانیوں نے ایک خود مختار ریاست باختر میں بھی قائم کی تھی۔ باختر کے بانی دی متر لیس اوّل کے بیٹے اگاتھوکلیس نے ۱۸۰ق۔م میں قندھار اور کابل سمیت صوبہ سرحد اور پنجاب کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کرلیا اور ٹیکسلا کو اپنی راجدھانی بنایا۔ مگر اگاتھوکلیس نے اپنی رعایا میں یونانی تہذیب کو رائج کرنے کی کوشش نہیں کی، نہ ان کے رہن سہن، رسم ورواج اور مذہب میں مداخلت کی۔

اسی اثنا میں ایک اور یونانی شہزادہ بدخشاں سے قسمت آزمائی کرتا ہوا ٹیکسلا پہنچا۔ اس کا نام مناندر تھا۔ مناندر نے اگاتھوکلیس کی بیٹی سے شادی کی اور شمال مشرقی پنجاب فتح کرنے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے ساکلا یعنی سیالکوٹ کو اپنی راجدھانی بنایا اور رفتہ رفتہ دریائے جمنا تک سارے علاقے پر قابض ہوگیا۔ مناندر بڑا روشن خیال اور وسیع مشرب فرماں روا تھا۔ اس نے بدھ مت اختیار کرلیا اور آخری عمر میں راج پاٹ چھوڑ کر بھکشو ہوگیا۔ بدھ مت میں اس کے اقوال اور فرمودات کو بہت اونچا مرتبہ حاصل ہے۔

مناندر کے بیٹے اپالوڈوٹس (Appolodotus) نے باپ کی سلطنت کو مزید وسعت دی اور سندھ، کاٹھیاواڑ اور گجرات بھی اس کے زیرِ نگیں ہوگئے مگر اس کی وفات (۹۰ق۔م) کے بعد یونانی سلطنت کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی اور تقریباً پچاس برس تک وادیٔ سندھ میں کوئی مضبوط حکومت قائم نہ ہوسکی۔ تب ۳۰ق۔م کے قریب ترکستان کی جانب سے ساکاؤں نے یلغار کی اور یونانی اقتدار کی شمع ہمیشہ کے لیے بجھ گئی۔

باختر کے یونانیوں نے وادیٔ سندھ پر اگرچہ فقط سو سال حکومت کی مگر انہوں نے یہاں کی تہذیب پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ برِصغیر میں پتھر کے مجسمے بنانے کا فن یونانیوں ہی نے رائج کیا۔ انہوں نے بدھ مت اختیار کرنے کے بعد یونانی روایت کے مطابق بدھ مت کی داستانوں کو یونانی طرز کے مجسموں میں منتقل کردیا۔ ان کے عہد میں صنم تراشی کو اتنا فروغ ہوا کہ آج ٹیکسلا، سوات، پشاور، لاہور اور کراچی کے عجائب گھر گوتم بدھ اور ان کے رفقا کے مجسموں سے بھرے پڑے ہیں۔ ناٹک بھی یونانیوں کی بہت پرانی روایت ہے چنانچہ یونانی راجاؤں نے ٹیکسلا

اور سیالکوٹ میں ناٹک منڈلیاں قائم کر رکھی تھیں جو یونانی ڈرامے اسٹیج کرتی تھیں۔ اسٹیج پر پردوں کی ریت اسی زمانے کی یادگار ہے۔ اسی بناء پر سنسکرت زبان میں ناٹک کے پردوں کو 'یوانیکا' کہتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بعد کے سنسکرت ڈراموں میں راجاؤں کا محافظ دستہ ہمیشہ یونانی عورتوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ٹیکسلا کے قریب سرکپ اور جانڈیال کی کھدائی سے پتہ چلتا ہے کہ یونانیوں نے ان بستیوں کو یونانی شہروں کے نمونے پر بسایا تھا۔ ٹیکسلا کے نواح میں اس دور کے سونے چاندی کے زیور، سنگھار کے سامان، بڑھیئوں، سناروں، لوہاروں، کمہاروں اور جراحوں کے اوزار، پتھر کے اوزان، کھیتی باڑی کے آلات، برتن بھانڈے، بچوں کے کھلونے، اسلحے، مورتیاں اور اُبھرواں چونہ کاری کی۔ اُبھرواں شبیہیں، مہریں اور سانچے بکثرت ملے ہیں۔ ان کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سونے چاندی کے زیوروں، مجسموں اور برتنوں کی ساخت تو یونانی ہے مگر روزمرّہ کے استعمال کی چیزوں کی بناوٹ مقامی ہے۔ جانڈیال کے مقام پر ایک عبادت گاہ بھی دریافت ہوئی ہے جو ایتھنز کے مشہور معبد پارتھنان کا ہو بہو چربہ ہے۔

بطلیموسی بادشاہوں نے مصر پر پونے تین سو سال (۳۰۴-۳۰ق۔م) حکومت کی۔ ان کے عہدِ عروج میں شام، فلسطین، قبرص، قریط اور مشرقی بحرِ روم کے دوسرے جزیرے مصر کے زیرِ نگیں تھے۔ بطلیموسیوں کا دارالسلطنت اسکندریہ جس کی آبادی چھ لاکھ تھی دنیا کا سب سے خوشحال اور ترقی یافتہ شہر سیال کیا جاتا تھا۔ مغربی ایشیا، عرب، ہندوستان اور لنکا کے تجارتی مال کی سب سے بڑی منڈی بھی اسکندریہ ہی میں واقع تھی۔ اس کی بندرگاہ میں جہازوں کی ریل پیل رہتی تھی جو ریشمی اور سوتی پارچہ جات، قالین، ہیرا اور موتی، لوہے اور تانبے کی چیزیں، لوبان اور دوسری خوشبوئیں، جڑی بوٹیاں اور مسالہ جات خرید کر یورپ کے بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔ اسکندریہ کے ساحل پر نصب کیے ہوئے مینارۂ نور کا شمار دنیا کے سات عجائبات میں ہوتا تھا۔ یہ مینار چار سوفٹ اونچا تھا اور سمندر میں تیس میل سے دکھائی دیتا تھا۔

بطلیموسی فرماں روا علم و حکمت بالخصوص سائنسی علوم کے بڑے دلدادہ تھے۔ ان کے گماشتے یونان، ایشیاء کوچک، شام و فلسطین میں انجینئروں، ریاضی دانوں، فلکیات کے عالموں، ریاضی، ہئیت، طب اور جغرافیہ کے عالموں کی تلاش میں رہتے اور ان کو اسکندریہ کی دعوت دیتے۔ بطلیموس اوّل نے تو فلسطین سے ایک ہزار یہودی عالموں کو زبردستی پکڑ بلوایا اور اسکندریہ میں آباد کیا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اسکندریہ بہت جلد علم و دانش کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ اسکندریہ کے شاہی کتب خانے کو جو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی اس کی تو نظیر نہیں ملتی۔ اس کتب خانے کو جو بہ یک وقت دارالتحقیق و تجربہ اور درس گاہ بھی تھا بطلیموس اوّل نے ۲۹۰ ق۔م میں ارسطو کی درس گاہ لائی سیئم کے اصولوں پر قائم کیا تھا۔ اسکندریہ کے کتب خانے میں ۵ لاکھ ۳۲ ہزار مخروطے تھے جن کی فہرست ۱۲۰ دفتروں پر محیط تھی۔ ان مخروطوں کو بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے حاصل کیا جاتا تھا۔ مثلاً بطلیموس سوئم کو پتہ چلا کہ ایتھنز میں کسی کے پاس یونان کے قدیم ڈرامہ نویسوں ایس کائی لس، سوفوکلیز اور یوری پڈیز کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے ڈرامے موجود ہیں۔ بادشاہ نے ۹۰ ہزار ڈالر بطور ضمانت ادا کیے اور وعدہ کیا کہ ڈراموں کو نقل کر کے اصل دستاویزیں واپس کر دی جائیں گی لیکن ڈرامے ہاتھ آ گئے تو اس نے اصل خود رکھ لی اور نقل مالک کو بھجوا دی اور کہلا دیا کہ زرِ ضمانت بے شک ضبط کر لو۔ درس گاہ میں معلموں کی تعداد ایک سو تھی۔ ان کو تنخواہ سرکاری خزانے سے ملتی تھی۔ درس گاہ سے ملحق ایک رصدگاہ تھی، ایک چڑیا گھر تھا، ایک باغ تھا جس میں انواع واقسام کے درخت، جڑی بوٹیاں، پودے اور پھول موجود تھے اور ایک عمارت چیر پھاڑ کرنے کی تھی۔ درس گاہ میں انجینئرنگ، ریاضی، فلکیات، طب اور جغرافیہ کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔

اسکندریہ کے دارالعلوم نے بڑے بڑے نابغہ روزگار سائنس داں پیدا کیے۔ اُقلیدس (۳۰۰ ق۔م) جس کی جیومیٹری ابھی کل تک دنیا میں ہر جگہ نصاب میں داخل تھی۔ ارشی میدس (۲۸۷۔۲۱۲ ق۔م) کا سا انجینئر، اراسیس تراتس (Erasistratus ۲۵۸ ق۔م) کا سا طبیب اور علم الابدان کا عالم اور ہیروفی لس (۳۰۰ ق۔م) جس نے دماغ اور اعصاب کی چیر پھاڑ کر کے ثابت کیا کہ عقلِ انسانی کا مرکز دماغ ہے نہ کہ بقول ارسطو دل۔ اس کے علاوہ بہت سی میکانکی ایجادوں کا سہرا بھی اسکندریہ کے انجینئروں کے سر ہے۔ مثلاً دریائے نیل کے پانی کو اوپر کھینچنے اور آگ بجھانے کے پمپ، آبی گھڑی اور علمِ نجوم اور جراحی کے متعدد آلات۔ یہ لوگ بھاپ اور گرم ہوا کی قوت کو استعمال کرنا بھی جانتے تھے۔ مگر افسوس کہ یہ انقلابی دریافتیں پروہتوں کی شعبدہ بازیوں، کرشموں اور کرامتوں کی نذر ہو گئیں۔

اسکندریہ میں یونانی فلسفے کا بھی یہی حشر ہوا۔ بطلیموسیوں کا جھکاؤ ارسطا طالیسی روایت کے مطابق سائنسی علوم کی طرف تھا البتہ پہلی صدی عیسوی میں اسکندریہ کے یہودیوں نے اپنے

مذہب کے بچاؤ کی خاطر افلاطونی فلسفے کو ترجیح دی۔ ان کے بڑے عالم فائلو (۲۰ق۔م۔۵۴ء) کو افلاطونی الٰہیات اور موسوی شریعت میں مطابقت پیدا کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کیونکہ دونوں کی اساس بہر حال مابعدالطبیعیاتی تھی۔ فائلو کی اشراقیت کو اسکندر افرودیسی فلاطینوس (۲۰۵ء۔۲۷۰ء) اور اس کے شاگرد فرفری یوس نے مزید ترقی دی اور اسکندریہ کا یہی نو افلاطونی فلسفہ بعد میں عیسائیوں اور مسلمانوں میں بھی پوری طرح رائج ہو گیا۔

پہلی صدی قبل مسیح میں بطلیموسیوں کے زوال اور روما کے عروج کا زمانہ تھا جولیس سیزر نے اسکندریہ کا رُخ کیا اور ملکہ قلوپطرہ کو بڑے تزک احتشام سے روم لے گیا مگر جلد ہی قتل ہوا اور قلوپطرہ کو اسکندریہ واپس آنا پڑا۔ اسی اثنا میں جولیس سیزر کے منہ بولے بیٹے اور مارک انطونی میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ انطونی نے روما کے مشرقی مقبوضات کی کمان سنبھالی، قلوپطرہ سے راہ و رسم پیدا کی اور مصر کے بحری بیڑے کے بل پر آگسٹس سیزر سے مقابلے پر آمادہ ہو گیا۔ انطونی کو بحری جنگ میں شکست ہوئی۔ آگسٹس اسکندریہ پر بلا لڑے قابض ہو گیا۔ انطونی قتل ہوا اور ملکہ قلوپطرہ نے سانپ سے ڈسوا کر خودکشی کر لی۔ آگسٹس نے مصر کو سلطنتِ روما کا صوبہ بنا دیا۔ بطلیموسی سلطنت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی (۳۰ق۔م)۔

اس کے بعد مشرق، ساحلِ فرات سے ساحلِ نیل بلکہ لیبیا اور الجزائر تک، سات سو سال تک رومتہ الکبریٰ کے تابع رہا۔ ان مقبوضات کے ساتھ روما کا رویہ قریب قریب وہی تھا جس کی تقلید بعد میں مغرب کی سامراجی طاقتوں نے کی۔ رومی حاکموں نے ہر جگہ اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنا رہن سہن، مذہب اور اپنے قوانین رعایا پر مسلط کیے۔ خراج اور محصولات سے کروڑوں کی رقم سونے چاندی کی شکل میں روم کو منتقل ہوتی اور روما کے لیے عیش و عشرت کے سامان فراہم کرتی۔ البتہ رومی شہنشاہیت دورِ حاضر کی سامراجیت سے اس لحاظ سے بہت مختلف تھی کہ رومیوں نے مقبوضات میں رعایا کی صنعتی، تجارتی اور زرعی سرگرمیوں کو کبھی نہ روکا بلکہ برابر ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ وجہ یہ تھی کہ رؤسائے روم کو اٹلی اور مقبوضات میں بڑی بڑی جاگیریں ملی ہوئی تھیں جن پر مفت کے غلام کام کرتے تھے۔ مرکز اور صوبوں کے اعلیٰ عہدے اور فوج کی اونچی آسامیاں بھی انہیں کا حق تھیں۔ البتہ ان کو کاروبار کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یوں بھی تجارت اور صنعت کاری کو وہ اپنی توہین سمجھتے تھے۔ چنانچہ دمشق، حلب، انطاکیہ، حمص، بیروت اور اسکندریہ میں صنعت و

حرفت نے خوب ترقی کی۔ مشرق کی اس برتری کا ذکر کرتے ہوئے گبن لکھتا ہے کہ:

'اُن دنوں مشرق فنون اور سامانِ عیش و آسائش کا مالک تھا۔ اہلِ مغرب کھیتی باڑی سے نابلد تھے یا زراعت کو حقارت سے دیکھتے تھے۔ حیوانات اور نباتات کی جتنی قسمیں ایشیا اور مصر سے یورپ میں رائج ہوئیں ان کا شمار ممکن نہیں ...... مثلاً تمام پھول، جڑی بوٹیاں اور پھل جو یورپی باغوں میں پائے جاتے ہیں مشرقی ہیں'۔[۲]

گبن لکھتا ہے کہ:۔

'روم کی خوش حال خواتین میں ریشمی کپڑوں اور مختلف قسم کی خوشبوؤں کی جو مذہبی رسوم اور تجہیز و تکفین میں استعمال ہوتی تھیں بڑی مانگ تھی۔ یہ چیزیں اسکندریہ کے ذریعے ملابار، لنکا اور یمن سے درآمد کی جاتی تھیں۔ روم کے پاس تبادلے میں فروخت کرنے کے لیے کوئی مال نہ تھا لہٰذا مشرق کی سب چیزیں سونے چاندی کے بدلے نقد خریدی جاتی تھیں (ایک پونڈ ریشمی کپڑے کی قیمت ایک پونڈ سونا تھی) چنانچہ اطالوی سینٹ (پارلیمنٹ) میں اکثر یہ شکایت سننے میں آتی تھی کہ ریاست کی دولت ہمیشہ کے لیے غیر ملکوں اور دشمن قوموں کے پاس چلی جاتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق روم کو ہر سال آٹھ لاکھ پونڈ (آج کل کے اسی کروڑ پونڈ) خسارہ برداشت کرنا پڑتا تھا'۔[۳]

چوتھی صدی عیسوی کے آغاز میں جب شہنشاہ روم قسطنطین اوّل (۲۷۴ء۔۳۳۷ء) عیسائی ہو گیا اور اس نے جرمنی کی وحشی قوم گوتھ کے حملوں سے اور روم کی آئے دن کی درباری سازشوں سے بچنے کے لیے قسطنطنیہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا تو مشرق اور مغرب کے تعلقات میں ایک بار پھر تبدیلی آئی بلکہ خود مغربی تہذیب کا چولا بدل گیا۔ اب اس پر عیسائی مذہب کا رنگ چڑھنے لگا اور یونانی دیومالا اور رومی صنمیات کی جگہ مسیحی عقائد نے لے لی۔

لیکن اسکندریہ میں علم و حکمت کا چرچا بدستور رہا اور شہر کی رونق میں بھی چنداں فرق نہ آیا۔ بطلیموسی نظام کا موجد کلاڈیس بطلیموس (۱۵۱ء جس کا کوئی تعلق شاہی خاندان سے نہ تھا) روما کے

دورِ اقتدار میں اسکندریہ ہی میں علمِ نجوم، ریاضی اور جغرافیہ کی تعلیم دیتا تھا اور مشہور اشراقی فلسفی فلاطینوس (۲۰۵ء۔۲۷۰ء) اور الیسا غوجی کا مصنف فلاطینوس کا سوانح نگار فرفری یوس بھی اسکندریہ ہی کے باشندے تھے۔ یونانی فلسفے نے خصوصاً تو فلاطونی فلسفے نے دراصل روما ہی کی سرپرستی میں اسکندریہ میں فروغ پایا۔

ہر چند کہ رومن فرماں رواؤں نے اسکندریہ کو بار بار لوٹا لیکن اس کی شان وشوکت بدستور باقی رہی۔ ۶۴۲ء میں اسکندریہ فتح کرنے کے بعد عمرو بن العاص شہر کی شان وشوکت کا حال بیان کرتے ہوئے خلیفہ دوئم حضرت عمر کو لکھتا ہے کہ:

> 'میں نے مغرب کے عظیم الشان شہر کو فتح کرلیا ہے مگر اس کے حسن و دولت کا شمار میرے لیے ممکن نہیں۔ میں بس اتنا عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ شہر میں چار ہزار محل ہیں، چار ہزار حمام ہیں، چار سو تھیٹر اور دوسری تفریح گاہیں، بارہ ہزار دکانیں ہیں جن میں غذا کا سامان اور ترکاریاں سبزیاں وغیرہ فروخت ہوتی ہیں اور چالیس ہزار باجگذار یہودی ہیں'۔[۴]

یہ الزام کہ عمرو نے اسکندریہ کے کتب خانے کو جلا کر حمام روشن کیے بالکل بے بنیاد ہے۔ گبن اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ دو سو برس تک کسی مورخ نے اس حادثے کا ذکر تک نہیں کیا۔ درحقیقت اس کتب خانے کو سب سے پہلے ۴۸ ق۔م میں جولیس سیزر نے آگ لگائی اور جو کچھ بچ رہا تھا اس کو شہنشاہ تھیوڈوسیس نے ۳۸۹ء میں نذرِ آتش کر دیا۔[۵] یہی وجہ ہے کہ عمرو اپنے خط میں کتب خانے کا ذکر تک نہیں کرتا۔

بازنطینی شہنشاہوں کے عہد میں طاقت کا مرکز نقل نہ صرف قسطنطنیہ منتقل ہوگیا بلکہ روم اُجڑ گیا اور یورپ کا بیشتر حصہ بھی صدیوں تک بازنطین کے زیرِ فرمان رہا۔ بازنطینیوں کا سب سے اہم تاریخی کارنامہ رومن ضابطۂ قوانین کی تدوین ہے۔ اس ضابطے کو شہنشاہ جسٹی نین اوّل (۵۲۷ء۔۵۶۵ء) کو چوٹی کے قانون دانوں کی مدد سے تیار کروایا تھا۔ یہ ضابطۂ قوانین جو رومن لاء کے نام سے مشہور ہے آج تک مغربی قوانین کی اساس سمجھا جاتا ہے۔ استنبول میں واقع ایا صوفیہ کا گرجا گھر جس کو بعد میں عثمانیوں نے مسجد بنا دیا شہنشاہ جسٹی نین ہی کا تعمیر کردہ ہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کے ظہور کے وقت بھی عراق، شام و فلسطین اور مصر میں یونانی

تہذیب ہی کا سِکّہ چلتا تھا۔ (خود حجاز میں خلافتِ راشدہ کے بہت بعد تک بازنطینی دینار و درہم ہی زرِ مبادلہ تھے۔)

اس یونانی تہذیب کا سب سے اہم مرکز اسکندریہ تھا۔ وہاں سے ایک طرف نوافلاطونی فلسفے کی وبا شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ پورے مغربی ایشیا میں پھیل گئی۔ دوسری طرف یونانی طب کا چشمہ پھوٹا اور تقریباً دو ہزار برس تک نہ صرف مسیحی دنیا کو فیض پہنچاتا رہا بلکہ مسلمان بھی اس مفیدِ عام علم سے خوب سیراب ہوئے۔ وہ جہاں گئے یونانی طب کو ساتھ لے گئے اور انہوں نے اپنی کاوش و تحقیق سے اس علم کو اتنی ترقی دی کہ ابوبکر رازی اور شیخ بوعلی سینا کے آگے حکیم جالینوس اور بقراط کی شہرت بھی ماند پڑ گئی (پیرس یونیورسٹی کے میڈیکل کالج کے بڑے ہال میں رازی اور بوعلی سینا کی قدآدم تصویریں آج بھی آویزاں ہیں)۔ ہمارے حکیم حضرات اب تک یونانی طب ہی کی بدولت زندہ ہیں اور بیماروں کا اُلٹا سیدھا علاج کرتے رہتے ہیں۔

مگر اسکندریہ کی نوافلاطونی سوچ نے اہلِ مشرق کی سوچ پر بڑا بُرا اثر ڈالا۔ یونان کے قدیم فلسفی، طالیس، انکسی مانڈر، فیثا غورث، انکساغورث، سقراط، افلاطون سب جمہوری ماحول اور روایت کے پروردہ تھے۔ وہ ذمے دار شہری تھے اور امورِ ریاست میں پورے انہماک سے شریک ہوتے تھے۔ دراصل ان کی فکر کا محرک ہی یہ جذبہ تھا کہ حالاتِ زندگی کی اصلاح کیونکر ہو اور لوگوں کو مفید اور اچھے شہری بنانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس کے برعکس اسکندریہ میں رومی شہنشاہیت کا راج تھا مگر شہنشاہی استعداد کو اچھے اور ذمے دار شہری درکار نہیں ہوتے بلکہ فرماں بردار اور اطاعت گزار رعایا درکار ہوتی ہے۔ ایسی رعایا جو معاشرے اور ریاست کے مسائل سے بے فکر ہو کر مابعدالطبیعیاتی موشگافیوں میں الجھی رہے۔ اس فریضے کو فائلو، فلاطینوس اور فرفری یوس وغیرہ نے بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ انہوں نے لوگوں کی سوچ کا رُخ زمین کے بجائے آسمان کی طرف پھیر دیا۔ نوافلاطونیوں کے اس اندازِ فکر پر تنقید کرتے ہوئے گبن لکھتا ہے کہ:

> 'یہ لوگ گہری سوچ کے مالک تھے اور اس سے کام لینا خوب جانتے تھے مگر انہوں نے فلسفے کا اصل مقصد سمجھنے میں غلطی کی لہٰذا ان کی کاوشوں سے فہمِ انسانی کی اتنی اصلاح نہیں ہوئی جتنی وہ مسخ اور خراب ہوئی۔ نوافلاطونیوں نے اس علم کو قطعاً نظر انداز کر دیا جو ہمارے معاملات اور ہماری صلاحیتوں

> کے لیے موزوں تھے اور اخلاقی، طبیعی اور ریاضی پر محیط تھے۔ اس کے برخلاف انہوں نے مابعدالطبیعیات کی لفظی بحثوں میں اپنی قوت صرف کی، غائب ازنظر عالم کے اسرار دریافت کرنے کی کوشش کی اور ایسے مباحث میں افلاطون اور ارسطو میں مطابقت پیدا کرنی چاہی جن سے یہ دونوں فلسفی اتنے ہی ناواقف تھے جتنی بقیہ نوع انسان۔[6]

نوافلاطونی فکر نے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچایا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ:

> 'مسلمانوں نے نوافلاطونی قیاس آرائیوں کو جو 'مہمل اور خرافات تھیں' ارسطو کا حقیقی فلسفہ سمجھ لیا۔ حیرت ہے کہ مسلمان فلسفی ـــ عرب اور ایرانی دونوں ہی اس خرافات کو ارسطو اور افلاطون کی حقیقی تعلیم تصور کرتے رہے مگر ان کو کبھی یہ خیال نہ آیا کہ ان فلسفیوں سے مکمل آگہی کے لیے یونانی زبان سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔ ان کی لاعلمی کا یہ حال تھا کہ وہ فلاطینوس کی ای نیڈ (Ennead) کے ترجمے کو ارسطو کی 'دینیات' سمجھ بیٹھے۔ ان کو ان دو عظیم یونانی استادوں کے فکر کا واضح شعور حاصل کرنے میں دو صدیاں لگیں پھر بھی اس میں شبہ ہے کہ وہ ان فلسفیوں کو کبھی بھی پوری طرح سمجھ سکے'۔[7]

مسیحی کلیسا نے جس کی سرپرستی بازنطین کرتا تھا نوافلاطونی فلسفے کو اپنی مذہبی تعلیمات میں شامل کرلیا تھا اور خانقاہوں اور درس گاہوں میں ہر جگہ نوافلاطونی فلسفے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کام میں نسطوری فرقے کے علما اور پادری بہت پیش پیش تھے۔ قیصریہ، انطاکیہ، نسبین، الروحہ، سلوشیا اور حیرہ میں ان کے بڑے بڑے مدرسے تھے مگر عراق، شام اور فلسطین کے لوگ چونکہ یونانی زبان سے آگاہ نہ تھے لہٰذا نسطوریوں نے نوافلاطونی فلسفیوں کی بیشتر تصنیفات کا سریانی زبان میں ترجمہ کیا اور ان کی شرحیں لکھیں۔ نوشیرواں کے مشہور مدرسے جُندشاپور میں بھی جہاں نسطوری علما کا عمل دخل تھا ہندوستانی اور یونانی طب کے پہلو بہ پہلو نوافلاطونی فلسفے ہی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ظہورِ اسلام کے وقت حرّان کے ستارہ شناس نجومیوں (صابئین) کے مدرسے کی بھی بڑی شہرت تھی

وہاں پر علم ہیئت و نجوم کا بڑا چرچا تھا۔

ڈی اولیری مغربی ایشیا پر یونانی فکر کے غلبے کی تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت ان مسیحی اور غیر مسیحی مدرسوں کے علاوہ ایران، عراق اور شام میں یونانی تہذیب کے دوسرے عوامل بھی کام کر رہے تھے۔ مثلاً یونانی فن تعمیر، انجینئری، حکمت، طب، مصوری اور مختلف سامانِ عیش کا استعمال' جس کی وجہ سے مغربی ایشیا گویا یونانی فنون میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب بنی اُمیّہ کا دورِ استبداد ختم ہوا اور مقامی آبادی کو آزادی نصیب ہوئی تو ہمیں اس بات پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اس کے معنی یونانیت کے احیاء کے تھے۔[۸]

یونانیت کے احیاء کا مقصد خواہ جدید علوم وفنون کی ترویج واشاعت رہا ہو یا یونانی فلسفہ اور منطق کی مدد سے اسلامی تعلیمات کے حق میں دلیلیں فراہم کرنا یا سلطنت کی سیاسی اور معاشرتی مصلحتوں کے تقاضے پورا کرنا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خلفائے بنی عباس بالخصوص ہارون رشید اور مامون رشید نے یونانیت کے احیاء میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔ کہتے ہیں کہ ہارون رشید کو انقرہ اور اُموریم پر حملوں کے دوران کئی یونانی مخطوطات ہاتھ لگے تھے اور مامون رشید نے بازنطینی شہنشاہ لیو سے فرمائش کر کے کئی یونانی کتابیں منگوائی تھیں۔ حتیٰ کہ المنصور نے بھی اسی طرح بازنطین سے کئی دستاویزیں حاصل کی تھیں جن میں کتاب اُقلیدس بھی تھی۔ مگر عرب یونانی زبان سے واقف نہ تھے لہٰذا ان کو نسطوری علما پر تکیہ کرنا پڑا جو یونانی سے سریانی میں اور پھر سُریانی سے عربی میں ترجمہ کرتے تھے۔

المامون کے باب الحکمت سے زمانہ واقف ہے۔ اس دار الترجمہ وتالیف میں نسطوری علما کی سرکردگی میں سائنسی علوم، طب اور فلسفہ و منطق کی بے شمار کتابیں یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ ان میں حکیم جالینوس، حکیم بقراط اور حکیم پال اور بطلیموس، ارشی میدس اور اقلیدس کی تصنیفات کے علاوہ افلاطون اور ارسطو سے منسوب فلسفے کی کتابیں اور فرفری یوس کی ایساغوجی (جو عربی مدارس میں شاید اب تک پڑھائی جاتی ہے) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ترجموں کا یہ دور تقریباً ایک صدی (۷۵۰ء۔۸۵۰ء) جاری رہا اور تب حکیم علی الطبری (۸۵۰ء)، ابوبکر محمد ابنِ ذکریا رازی (۸۶۵ء۔۹۲۵ء)، الکندی، الفارابی، المجوسی (۹۹۴ء) اور ابنِ سینا (۹۸۰ء۔۱۰۳۷ء) کی طبع زاد تصنیفوں کا دور شروع ہوا۔ البتہ ان کی تخلیقات پر یونانی حکما اور

فلاسفہ کی چھاپ بہت گہری ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ علم وحکمت کا دھارا مشرق سے مغرب کی سمت بہنے لگا۔ مسلمانوں نے یونانی فکر وفن سے جو کچھ حاصل کیا تھا اس کو گراں بہا اضافوں کے ساتھ مغرب کو لوٹا دیا۔ وہ بھی اس پُر آشوب زمانے میں جب یورپ والوں کی جیب میں تہذیب کا ایک سِکّہ بھی باقی نہ بچا تھا۔ رومتہ الکبریٰ کے زوال وسقوط کے بعد گاتھ، ہُن اور ونیڈل قوموں نے سب چراغ بجھا دیئے تھے اور پورا برِاعظم جہالت اور توہم پرستی کی سیاہ چادر اوڑھے سورہا تھا۔ اس ہزار سالہ دورِ ابتلا کو مورّخ یورپ کے 'عہدِ تاریک' سے تعبیر کرتے ہیں۔

یورپ کو اندھیرے سے اُجالے میں لانے والے اسپین کے عرب فاتح تھے۔ ان کے قبضے کی ابتدا یوں تو طارق ابنِ زیاد (۷۱۱ء) اور موسیٰ ابن نُصیر (۷۱۲ء) کے کامیاب حملوں سے ہوئی لیکن سلطنت کی بنیاد اموی شہزادے عبدالرحمٰن اوّل (۷۵۰ء۔۷۸۸ء) نے رکھی۔ یہ سلطنت تقریباً پونے تین سو سال تک قائم رہی۔ اموی خاندان کا سب سے مشہور فرماں روا عبدالرحمٰن سوئم (۹۱۲ء۔۹۶۱ء) تھا۔ اس کے عہد میں اسپین نے زراعت، صنعت وحرفت اور علوم وفنون میں بڑی ترقی کی۔ امویوں کا دارالخلافہ قرطبہ یورپ کا سب سے مہذب شہر خیال کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ 'لیون، نوارے اور بارسیلونا کے (عیسائی) بادشاہوں کو جب کبھی کسی جراح، ماہرِ تعمیرات کی یا کسی اچھے موسیقار یا درزی کی ضرورت پڑتی تو وہ قرطبہ ہی سے درخواست کرتے'۔ [۹]

اس وقت قرطبہ میں جس کی آبادی پانچ لاکھ تھی سات سو مسجدیں تھیں، تین سو حمام تھے اور ستر کتب خانے۔ مدرسوں کا شمار نہ تھا اُون اور ریشم کے کپڑے قرطبہ اور ملاگا میں بُنے جاتے تھے۔ فقط قرطبہ میں پارچہ بافوں کی تعداد تیرہ ہزار تھی (ریشم پیدا کرنے کی صنعت اسپین میں مسلمانوں ہی نے شروع کی)۔ سونے اور چاندی کی کانیں الغرب میں تھیں۔ شیشہ سازی اور پیتل کے برتن المیرا میں تیار ہوتے تھے، مٹی کے روغنی برتن ویلنسیا میں بنتے تھے۔ لوہے اور جستے کا کام قرطبہ میں ہوتا تھا اور تلواریں طولیدو میں ڈھالی جاتی تھیں۔ [۱۰]

مسلمانوں نے صنعت وحرفت ہی کو فروغ نہیں دیا بلکہ اہلِ مغرب کو زراعت اور باغبانی کے نئے طریقوں سے بھی متعارف کیا۔ نہروں کے ذریعے آبپاشی کرنا اور چاول، کپاس، گنّے اور زعفران کی کاشت کرنا انہیں نے سکھایا۔ اس کے علاوہ انار، انگور، خوبانی، سنگترے جیسے میوہ دار

درخت اسپین کی زمین پر سب سے پہلے عربوں ہی نے لگائے۔'یہ زرعی ترقی مسلم اسپین کا درخشاں کارنامہ تھی اور عربوں کا ابدی تحفہ سرزمینِ اندلس کو'۔[11]

عربوں سے پہلے اسپین کیا پورے مغربی یورپ میں تعلیم کلیسا کی جاگیر تھی۔ پادریوں کے علاوہ پڑھے لکھے افراد انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ عربوں نے جگہ جگہ مدرسے کھولے اور تعلیم عام کی۔ چنانچہ پروفیسر دوزی کا تو دعویٰ ہے کہ 'اسپین میں قریب قریب ہر شخص لکھ پڑھ سکتا تھا جبکہ یورپ سرے سے جاہل اور اَن پڑھ تھا'۔[12] اعلیٰ تعلیم کے لیے قرطبہ، سیویل، ملاگا اور غرناطہ میں یونیورسٹیاں قائم تھیں۔ قرطبہ کے دارالعلوم میں ریاضی، طب، قانون اور دینیات کے خاص شعبے تھے اور غرناطہ میں کیمسٹری، فلسفہ، نجوم اور طب پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ ان یونیورسٹیوں میں فرانسیسی، انگریز اور اطالوی طلبا کو بھی تعلیم حاصل کرنے کی پوری آزادی تھی۔ وہیں کے فارغ التحصیل عیسائی طلبا نے طب، فلسفہ اور سائنسی علوم کی عربی تصنیفات لاطینی زبان میں ترجمہ کیں۔

یورپ میں تعلیم عام نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اہلِ مغرب کاغذ سازی کے ہنر سے ناواقف تھے۔ یہ فن عرب مراکش سے اپنے ہمراہ لائے اور تب کتابوں کی اشاعت نے پہلے اسپین میں اور پھر دوسرے ملکوں میں رواج پایا۔ کاغذ سازی کا سب سے بڑا مرکز شطبیہ تھا۔ 'طباعت' کی ابتدا بھی سب سے پہلے عربوں نے کی۔ وہ لکڑی کے بلاکوں پر کھدوا کر ان سے دستاویزوں کی نقلیں چھاپ لیتے تھے جس طرح ہمارے دستکار کپڑے چھاپتے ہیں۔ کتابوں کا سب سے بڑا بازار قرطبہ تھا۔

مسلمانوں کے عہد میں اسپین کی سرکاری زبان عربی تھی اور تعلیم بھی عربی میں دی جاتی تھی۔ مگر شمالی اسپین کی خودمختار عیسائی ریاستوں میں بھی عربی کا اتنا اثر تھا کہ لوگ لاطینی زبان بھی عربی میں لکھتے تھے۔ چنانچہ اراغون کا بادشاہ پیٹر اوّل (۱۱۰۴ء) فقط عربی میں لکھ پڑھ سکتا تھا اور طولیدو پر قبضہ کرنے (۱۰۸۵ء) کے بعد بھی شاہ الفانسو اور اس کے جانشین دو سو سال تک اپنے سِکّوں پر عربی حروف ہی کندہ کرواتے رہے۔

غرضیکہ مغربی یورپ میں تہذیبِ نو کی نشوونما کے لیے سازگار حالات اسپین اور سسلی کے عربوں نے پیدا کیے چنانچہ پروفیسر فشر کے سے متعصب مورخ کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ 'بارہویں صدی میں روشنی کی جو کرنیں یورپ میں پہنچیں وہ یونان سے نہیں بلکہ اسپین کے عربوں

کے ذریعے آئیں اور پروفیسر فلپ حِتی لکھتا ہے کہ:

'یورپ کے قرونِ وسطیٰ کی فکری تاریخ میں مسلم اسپین نے انتہائی درخشاں ابواب تحریر کیے۔ آٹھویں اور ۱۳ ویں صدی کے دوران عربی بولنے والے ساری دنیا میں تہذیب و تمدن کے مشعل بردار تھے۔ مزید برآں انہیں کی کوششوں سے قدیم سائنس اور فلسفے کی بازیابی ہوئی۔ انہوں نے اس علم میں اضافہ کیا اور اس کو دوسروں تک اس طرح پہنچایا کہ مغرب نشاۃ ثانیہ سے آشنا ہوا۔ ان کاموں میں ہسپانوی عربوں کا بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے یونانی فلسفے کو مغرب میں منتقل کیا۔ مغربی یورپ میں نئے خیالات کا یہ بہاؤ بالخصوص فلسفیانہ خیالات کا یہ زبردست بہاؤ عہدِ تاریک کے اختتام کی ابتدا کا موجب بنا۔'[۱۳]

*جس طرح نویں صدی عیسوی یونانی، سُریانی اور سنسکرت تصنیفات کے عربی ترجموں کی صدی تھی اسی طرح بارہویں اور تیرہویں صدی (۱۱۲۵ء۔۱۲۸۰ء) کو عربی سے لاطینی میں ترجمے کا زمانہ کہتے ہیں۔ اسپین میں ان دنوں یوں تو بے شمار اہلِ قلم موجود تھے جو عربی، لاطینی اور فرانسیسی زبانوں پر پورا عبور رکھتے تھے لیکن ترجمہ کرنے والوں میں سرِ فہرست نام اطالوی عالم جرارڈ آف کری مونا (۱۱۱۴ء۔۱۱۸۷ء) کا ہے۔ علم کی پیاس اس کو طولیدو لائی اور پھر وہ وہیں کا ہو رہا۔ جرارڈ نے اسّی (۸۰) کتابیں عربی سے لاطینی میں منتقل کیں۔ ان میں بطلیموس کی 'المجسطی'، خوارزمی کی 'حساب الجبر والمقابلہ'، بوعلی سینا کی 'قانون الطب' (جو مغربی یونیورسٹیوں میں صدیوں تک داخلِ

---

* اس پیراگراف سے صفحہ ۳۳ پر شروع ہونے والے اگلے سیکشن (جنگ صلیبیہ) کے آغاز تک کا مواد سبطِ حسن صاحب نے براہِ راست اپنی کتاب 'نویدِ فکر' کے باب 'سیکولرازم' سے لیا ہے۔ مصنف نے اپنے اصل مسودے میں 'نویدِ فکر' کے مذکورہ حصے کو فوٹو اسٹیٹ کروا کر چسپاں کر رکھا تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وہ ان صفحات میں بیان کردہ تفصیلات کو از سرِ نو لکھ کر موجودہ باب کا حصہ بنانا چاہتے تھے یا وہ ان کو اقتباس کی صورت میں درج کرنا چاہتے تھے۔ ان پیراگرافوں کی مجموعی طوالت کو دیکھتے ہوئے بعد الذکر اندازہ زیادہ درست معلوم نہیں ہوتا اور زیادہ امکان اسی بات کا نظر آتا ہے کہ انہوں نے ان صفحات کو فوٹو اسٹیٹ کروا کر اس مقام پر شاید اس خیال سے چسپاں کیا ہو کہ بعد میں ان کو مختلف الفاظ میں ضابطۂ تحریر میں لے آئیں گے (مرتب)۔

نصاب رہی) حکیم ابوبکر رازی کی کتاب 'سرّ الاسرار' (جو ڈھائی سو سال تک کیمسٹری کی سب سے مستند کتاب سمجھی جاتی رہی) اور جابر ابنِ افلاح کی کتاب 'الحیات' قابلِ ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ الجاحظ کی کتاب 'الحیوان'، ابوبکر رازی کی کتاب 'الطب المنصوری' (جو دس جلدوں میں تھی) خوارزمی اور البطانی کی 'کتاب زج'، ابنِ بیطار اور ابن باجہ کی تصنیفات اور الحادی کی کتاب جو یونانی، ایرانی اور ہندی طب کی قاموس تھی لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئیں۔ بعض عرب حکما براہِ راست لاطینی زبان میں لکھتے تھے مثلاً ابوجعفر احمد بن محمد غفقی جو قرطبہ کا مشہور طبیب تھا۔ اس نے 'الادویہ مفردہ'، عربی، بربر اور لاطینی تینوں زبانوں میں لکھی۔ اس کتاب کے سلسلے میں غفقی نے اسپین اور افریقہ کے دورے کیے اور آٹھ سو سے زیادہ مفردات کے نام اور ان کے خواص اکٹھا کیے۔ یہ سب حکما جن کا ہم نے ذکر کیا ہے پیشے کے اعتبار سے طبیب تھے یعنی اپنے عہد کے سائنسداں جبھی تو پروفیسر لانگے مشہور جرمن مفکر ہمبولٹ کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ 'عربوں کو طبیعیاتی سائنسوں کا حقیقی بانی سمجھنا چاہیے'۔

قرونِ وسطیٰ کے جن مسلمان حکمانے مغربی فکر کو سب سے زیادہ متاثر کیا ان میں ابوبکر رازی (وفات ۹۲۵ء) اور ابنِ رُشد (۱۱۲۶ء۔ ۱۱۹۸ء) کے نام سرِ فہرست ہیں رازی، رے (تہران) کا رہنے والا تھا مگر بغداد منتقل ہوگیا تھا۔ وہ نہایت آزاد خیال اور روشن فکر سائنس دان تھا۔ البیرونی اس کی ۵۶ تصنیفات کا ذکر کرتا ہے لیکن اس کی کتابوں کی تعداد سو سے بھی زیادہ ہے (۳۳ نیچرل سائنس پر، ۲۲ کیمسٹری پر، ۱۷ فلسفے پر، ۱۴ مذہبیات پر، ۱۰ ریاضی پر، ۸ منطق پر، ۶ مابعدالطبیعیات پر اور ۱۰ متفرقات)۔ رازی کی تصنیفات پہلے جرارڈ نے لاطینی میں ترجمہ کیں پھر بادشاہ چارلس آف آنجو کے حکم سے تیرہویں صدی میں ترجمہ ہوئیں۔ یورپ میں اس کا نام Rhaze تھا۔ وہ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے آخری عمر میں اندھا ہوگیا تھا۔

رازی اسلاف پرستی کے سخت خلاف ہے۔ وہ منقولات کی حاکمیت کو نہیں تسلیم کرتا بلکہ عقل اور تجربے کو علم کا واحد ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس کی سوچ کا انداز عوامی تھا۔ وہ کہتا تھا کہ عام لوگ بھی اپنے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور سائنسی سچائیوں کے ادراک کے اہل ہیں۔ اس کا قول تھا کہ ہم کو فلسفے اور مذہب دونوں پر تنقید کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ وہ معجزوں کا منکر تھا کیونکہ معجزے قانونِ قدرت کی نفی کرتے ہیں اور خلافِ عقل ہیں۔ وہ مذاہب کی صداقت کا بھی چنداں

قائل نہیں کیونکہ مذاہب عموماً حقیقتوں کو چھپاتے ہیں اور لوگوں میں نفرت اور عداوت پیدا کرتے ہیں۔ وہ معاشرے کے بارے میں افلاطون کی کتاب 'تماؤس' کے ارتقائی تصور سے اتفاق کرتا ہے اور اقتصادی پہلو کو اہمیت دیتے ہوئے تقسیمِ کار کی افادیت پر زور دیتا ہے۔

رازی ارسطو کا پیرو نہیں ہے بلکہ اپنے آپ کو ارسطو سے بڑا مفکر سمجھتا ہے۔ وہ ارسطو کی 'طبیعیات' کو رد کرتا ہے اور دیمقراطیس اور اپی قورس کے ایٹمی فلسفے کے حق میں دلیلیں دیتا ہے۔ اس کے خیال میں تمام اجسام مادی ایٹموں پر مشتمل ہیں اور خلا میں حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ارسطو کے برعکس وہ خلا کے وجود بالذات کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کی رائے میں پانچ قوتیں ابدی اور لافانی ہیں۔ خدا، روح، مادّہ، زمان ومکان۔ وہ کہتا تھا کہ سائنس میں حرفِ آخر کوئی نہیں بلکہ علوم نسلاً بعد نسل ترقی کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا انسان کو لازم ہے کہ اپنے دماغ کی کھڑکیاں کھلی رکھے اور منقولات کے بجائے حقیقی واقعات پر بھروسہ کرے۔[۱۴]

طبیب تو ابنِ رشد بھی تھا لیکن یورپ میں اس کی شہرت کی وجہ فلسفہ تھا بالخصوص ارسطو کی شرحیں۔ 'ابنِ رشدیت بارہویں صدی سے سولہویں صدی تک یورپ میں سب سے غالب مدرسۂ فکر تھا حالانکہ عیسائی پادری اس کے سخت خلاف تھے'۔ ابنِ رشد کی تعلیمات کا لبِ لباب یہ تھا کہ (۱) کائنات اور مادہ ابدی اور لافانی ہے، (۲) خدا دنیاوی امور میں مداخلت نہیں کرتا، (۳) عقل لافانی ہے اور علم کا ذریعہ ہے۔

ارسطو کی تصانیف بالخصوص 'طبیعیات' اور 'مابعدالطبیعیات' پر ابنِ رُشد کی شرحیں پیرس پہنچیں تو کلیسائی عقائد کے ایوان میں ہل چل مچ گئی۔ معلّم اور متعلم دونوں مسیحی عقیدۂ تخلیق، معجزات اور روح کی لافانیت پر علانیہ اعتراض کرنے لگے۔ حالات اتنے تشویشناک ہو گئے کہ ۱۲۱۰ء میں پیرس کی مجلسِ کلیسا نے ارسطو کی تعلیمات بالخصوص ابنِ رشد کی شرحوں کی اشاعت ممنوع قرار دے دی مگر کسی نے پروانہ کی لہٰذا ۱۲۱۵ء میں پوپ نے پوری عیسائی دنیا میں ان کتابوں پر پابندی لگا دی۔ پابندیوں کی وجہ سے ابنِ رُشد کی مقبولیت اور بڑھ گئی۔ پوپ اسکندر چہارم نے رُشدیت کے ابطال کے لیے پادری البرٹس مغنوس سے ایک کتاب لکھوائی مگر وہ بھی قریب قریب ہر صفحے پر بوعلی سینا کا اقتباس پیش کرتا ہے اور مسلمان مفکرین کے حوالے دیتا ہے۔ ۱۲۶۹ء میں ابنِ رُشد سے منسوب تیرہ مقولوں کی تعلیم مذہب کے خلاف قرار پائی۔ ان میں سے بعض یہ ہیں: سب انسانوں

کے دماغ کی ساخت یکساں ہے۔ دنیا لافانی ہے۔ آدم کی تخلیق افسانہ ہے۔ انسان اپنی مرضی میں آزاد ہے اور اپنی ضرورتوں سے مجبور، خدا کو روزمرّہ کے واقعات کا علم نہیں ہوتا اور انسان کے اعمال میں خدا کی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ مگر ابنِ رُشدیت کی مقبولیت کم نہ ہوئی۔ تب ۱۲۷۷ء میں ابنِ رُشد کے ۲۱۹ مقولوں کے خلاف فتویٰ صادر ہوا مثلاً تخلیق محال ہے۔ مُردے کا جسم دوبارہ زندہ نہیں ہوسکتا۔ قیامت کا اعتقاد فلسفیوں کو زیب نہیں دیتا۔ فقہائے مذہب کی باتیں قصہ کہانیاں ہیں۔ دینیات سے ہمارے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ دینِ مسیحی حصولِ علم میں حارج ہے۔ مسرت اسی دنیا میں حاصل ہوسکتی ہے نہ کہ آخرت میں۔

فرانس میں رُشدیت کا سب سے بڑا علم بردار پیرس یونیورسٹی کا پروفیسر سیگر (۱۲۲۵ء۔۱۲۸۱ء) تھا۔ اس پر ۱۲۷۷ء میں مذہبی عدالت میں مقدمہ چلا اور عمر قید کی سزا ملی۔ اسیری کے دن اس نے روم میں گزارے اور وہیں قتل ہوا۔ ان سختیوں کے باوجود ابنِ رُشد کے خیالات ذہنوں کو متاثر کرتے رہے یہاں تک کہ وِل ڈیورنٹ کے بقول ۱۳ویں صدی کے وسط میں ابنِ رُشدیت تعلیم یافتہ طبقے کا فیشن بن گئی اور ہزاروں افراد ابنِ رُشدیت کے اس خیال سے اتفاق کرنے لگے کہ قوانینِ قدرت کے عمل میں خدا بالکل مداخلت نہیں کرتا، کائنات لافانی ہے اور جنت دوزخ عوام کو بہلانے کے بہانے ہیں۔[15]

معتزلہ کے زیرِ اثر فرانس میں ایسے مُفکر بھی پیدا ہونے لگے جو کہتے تھے کہ خدا نے کائنات کی تخلیق کے بعد نظامِ کائنات کو قوانینِ قدرت کے سپرد کردیا ہے لہٰذا معجزہ محال ہے کیونکہ معجزوں سے قوانینِ قدرت کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ دعاؤں تعویزوں سے عناصرِ قدرت کے عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ التجاؤں سے نہ طوفان کو روکا جاسکتا ہے، نہ بارش لائی جاسکتی ہے اور نہ بیماریوں کا علاج ہوسکتا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ نباتات اور حیوانات کی نئی قسمیں عملِ تخلیق کا کرشمہ نہیں بلکہ قدرتی ارتقا کا نتیجہ ہیں اور یہ عقیدہ کہ قیامت کے دن مُردے جی اٹھیں گے درست نہیں کیونکہ روح اور جسم دونوں فانی ہیں۔ ان کے ساتھ قدیم یونانی فلسفی اپی قورس (۳۴۱۔۲۷۰ق م) اور اس کے روحانی شاگرد لوکری شیئش (۹۹۔۵۵ق م) کا اثبی فلسفہ مقبول ہونے لگا اور یہ خیال عام ہوا کہ حقیقی دنیا یہی ہے۔ آخرت محض افسانہ ہے۔

یورپ میں سائنسی تجربوں کا دور عربی تصانیف کے لاطینی ترجموں کے بعد شروع ہوا۔ اس دور

کے سائنس دانوں میں سب سے ممتاز روجر بیکن (۱۲۱۴ء۔۱۲۹۴ء) ہے۔ تحصیلِ علم کے شوق میں وہ آکسفورڈ سے فرانس، اٹلی اور غالباً اسپین بھی گیا۔ وہیں وہ مسلمان سائنسدانوں کے خیالات سے واقف ہوا۔ وہ اسلامی سائنس اور فلسفے کے احسانات کا اعتراف اپنی کتابوں میں بار بار کرتا ہے۔ روجر بیکن کے نزدیک علم و آگہی کا واحد ذریعہ تجربہ ہے۔ 'جو شخص مظاہر قدرت کی سچائیوں تک بلا شک وشبہ پہنچنا چاہتا ہو اس کو لازم ہے کہ تجربوں پر وقت صرف کرے کیونکہ نیچری سائنس میں تجربہ ہی واحد ثبوت فراہم کرتا ہے'۔ آکسفورڈ واپس جا کر اس نے ابن ہیثم کی بصریات پر تجربے شروع کیے تو کلیسا کی طرف سے اس کی باقاعدہ نگرانی ہونے لگی اور پادری یوناوَن ترا (۱۲۲۱ء۔۱۲۷۴ء) نے دھمکی دی کہ 'علم وحکمت کا درخت بہتوں کو شجرِ حیات سے گمراہ کر دیتا ہے اور جہنم کے ہولناک عذابوں کی تمہید ہوتا ہے'۔ روجر بیکن کو مذہبی عدالت کے حکم سے قید کر دیا گیا اور وہ پندرہ سال بعد رہا ہوا۔

جنگِ صلیبیہ

گیارہویں صدی کے اواخر میں امویوں کا آفتابِ اقبال ڈوب گیا۔ پہلے المرابطہ برسرِ اقتدار آئے جو بربر تھے (۱۰۶۱ء۔۱۱۴۷ء) ان کو موحدّین نے بے دخل کیا۔ پھر رفتہ رفتہ پورا اندلس چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں بٹ گیا جو شمال کے مشترکہ دشمنوں کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کے بجائے آپس ہی میں لڑنے لگیں۔ اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر عیسائی بادشاہتوں نے تقریباً نصف اسپین پر قبضہ کر لیا۔ ادھر مشرق میں عباسی سلطنت بھی چراغ سحری ہو رہی تھی۔ مصر پہلے ہی سے فاطمیوں کے قبضے میں تھا۔ حلب اور حمص (شام) پر ہمدانیوں کی حکومت تھی، خراسان (مرو اور ہرات) میں سامانی تخت نشین تھے عراق اور مغربی ایران بشمول بغداد میں بوہیدی سیاہ وسپید کے مالک بن گئے اور خلیفہ کی حیثیت وظیفہ خوار فرماں روا سے زیادہ نہ تھی۔ جنگِ صلیبیہ کے وقت اگرچہ عنان اختیار سلجوقی ترکوں کے ہاتھ میں تھی مگر مغربی طاقتوں نے عباسی سلطنت کی داخلی کمزوریوں کو بھانپ لیا تھا۔ بازنطین میں تو اتنی سکت نہ رہی تھی کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیابی کی کوشش کرتا لیکن یہ فریضہ کلیسا نے اپنے ذمے لیا۔

صلیبی جنگیں (۱۰۹۵ء۔۱۲۹۱ء) کہنے کو تو عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی لڑائیاں

تھیں جن کا مقصد یروشلم، بیت لحم اور فلسطین کے دیگر مقدس مقامات کو مسلمانوں کے قبضے سے آزاد کروانا تھا لیکن حقیقت میں اہلِ مغرب نے مال و دولت کے لالچ پر مذہب کی نقاب ڈال لی تھی۔ وہ شام، لبنان اور فلسطین کی صنعت و تجارت پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اُمرا زر و جواہر کی طمع میں، شہزادے علاقوں کی تسخیر کی آرزو میں، اٹلی کی شہری ریاستیں اپنی تجارت کو وسعت دینے اور حلب، دمشق اور بیروت کی صنعت گاہوں کو اپنے تصرف میں لانے کی غرض سے صلیبی جنگوں میں شریک ہوئی تھیں۔

صلیبی جنگیں دو سو سال تک جاری رہیں۔ اس دوران صلیبی فوجیں نہ صرف طرسوس سے غازہ تک بحرِ روم کے پورے ساحلی علاقے پر قابض ہوگئیں بلکہ انہوں نے قسطنطنیہ اور بازنطیق کے دوسرے عیسائی شہروں کو بھی بار بار لوٹا۔ انہوں نے انطاکیہ، الروحا (شمال مغربی عراق)، تری پولی (لبنان) اور بیت المقدس (فلسطین) میں اپنی بادشاہتیں بھی قائم کر لیں۔ البتہ جب ۱۱۷۱ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی مصر میں برسرِ اقتدار آیا تو مسلمانوں کے تنِ بے جان میں جان آئی۔ سلطان نے صلیبیوں کو پے در پے شکست دی اور سارے علاقے صلیبیوں سے خالی کروالیے۔ ۱۲۹۱ء میں جب صلیبیوں کا آخری شہر عقرہ بھی ہاتھ سے نکل گیا تو جنگ ختم ہوگئی۔

اس جنگ سے اگر کسی کو فائدہ پہنچا تو وہ اٹلی کی تجارتی جمہوریتیں وینس، جنیوا، نیپلز اور فلورنس تھیں۔ وہاں جہاز رانی اور اسلحہ سازی کی صنعتوں نے بڑی ترقی کی۔ حمص، حلب اور دمشق کی مصنوعات ان کے تصرّف میں آئیں اور جہازوں میں لد لد کر یورپ پہنچنے لگیں۔ بقول مارکس 'صلیبی جنگوں نے مغرب کو مشرقی مصنوعات سے متعارف کیا اور ان کی مانگ مغربی یورپ میں بہت بڑھ گئی'۔[۱۹] اٹلی کے ان شہروں میں اونی اور ریشمی کپڑوں اور شیشہ سازی کی صنعتیں خوب پھلی پھولیں۔ دولت کی ریل پیل ہوئی۔ علم و فن نے فروغ پایا اور جگہ جگہ یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں۔ پیرس، پیڈودا، بولونیا، آکسفورڈ، اوی نان اور سالامانکا کی یونیورسٹیوں میں عربی، عبرانی اور سُریانی کے باقاعدہ شعبے کھل گئے۔ یورپ ہزار سالہ خواب سے جاگ اٹھا۔ سرمایہ داری نظام کی پو پھٹی اور نشاۃ ثانیہ کی صبح طلوع ہوگئی۔

جب تک قسطنطنیہ پر بازنطینیوں کی حکومت رہی اطالوی سوداگر وہاں کی بین الاقوامی منڈی کے اجارہ دار بنے رہے مگر ۱۴۵۹ء میں جب عثمانیوں نے قسطنطنیہ کو بھی تسخیر کرلیا اور رفتہ رفتہ

رومانیہ، بلغاریہ اور پورے جزیرہ نمائے بلقان پر قابض ہو گئے تو اطالوی صنعت و تجارت کو بڑا دھکا لگا۔ تب ان کو جنوب مشرقی ایشیا اور چین کی منڈیوں تک پہنچنے کے لیے متبادل بحری راستوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کولمبس اور واسکوڈی گاما کی بحری مہموں کا مقصد متبادل راستوں ہی کی دریافت تھا۔ کولمبس جس کا وطن جنیوا تھا ہندوستان کے ارادے سے نکلا تھا مگر بھٹک کر امریکہ پہنچ گیا (۱۴۹۲ء)۔ واسکوڈی گاما نے جو پرتگالی تھا ۱۴۹۸ء میں کالی کٹ کی بندرگاہ میں لنگر ڈالے۔ ان دونوں انقلاب آفریں دریافتوں سے مغرب اور مشرق کے درمیان نئے رشتوں کی ابتدا ہوئی۔ مغربی یورپ میں تجارتی سرمایہ داری نے فروغ پایا اور سیاسی اور اقتصادی طاقت کا مرکزِ ثقل بحرِ روم سے بحرِ اوقیانوس کے ساحلی ملکوں پرتگال، اسپین، ہالینڈ اور برطانیہ میں منتقل ہو گیا۔

ان ملکوں کے بحری قزاقوں اور تاجروں نے شاہی سرپرستی میں شمالی اور جنوبی امریکہ اور مغربی افریقہ کے باشندوں پر جو ظلم ڈھائے اور ان کی دولت کو جس طرح لوٹا اس کی خونی داستان بڑی المناک ہے البتہ وہ ایشیا میں یہ طرزِ عمل اختیار نہ کر سکے کیونکہ یہاں اس وقت تک طاقتور حکومتیں قائم تھیں۔ شروع شروع میں مغربی بیوپاریوں نے ہندوستان، لنکا اور جاوا سے مسالے، ریشمی اور سوتی کپڑے اور عیش و آسائش کے سامان سونے چاندی کے عوض خریدنے پر ہی اکتفا کی۔ پھر اپنی بحری طاقت کے بل پر گوا، سورت، کولمبو، جاوا اور دوسرے ساحلی علاقوں میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ ان کی حفاظت کے بہانے سپاہی اور اسلحے لائے۔ مقامی عہدے داروں اور تاجروں کو رشوت دے کر اپنے دام میں پھنسایا اور جب مرکزی حکومت کمزور ہو گئی تو خودمختار ریاستوں میں سازش کا جال بچھا کر پہلے شاہ گر بنے پھر رفتہ رفتہ ان ریاستوں کو اپنا تابع فرمان بنا لیا۔ آرکاٹ، حیدرآباد دکن، بنگال، جاوا اور ملایا ہر جگہ اسی حکمتِ عملی سے کام لیا گیا۔ اس طرح مقبوضات کی اندرونی اور بیرونی تجارت ان کی اجارہ داری ہو گئی اور جب مغربی یورپ میں خودکار مشینیں ایجاد ہوئیں اور مصنوعات کی پیداوار بڑھی تو مشرق ان مصنوعات کے لیے بازار اور خام مال فراہم کرنے کی منڈی بن گیا۔ بین الاقوامی تجارت کی وسیع پیمانے پر افزونی کے باعث ساری دنیا مغربی مصنوعات کا بازار بن گئی۔ سرمایہ داری نظام نے پورے کرۂ ارض کو تاریخ میں پہلی بار ایک اقتصادی وحدت میں تبدیل کر دیا۔ اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے مارکس لکھتا ہے کہ:

'بورژوا سوسائٹی کا بنیادی فریضہ (اپنی مصنوعات کے لیے) بازار حاصل

کرنا اور (مقامی) پیداوار کو اس عالمگیر بازار کے تابع کرنا تھا۔ دنیا چونکہ
گول ہے لہٰذا آسٹریلیا اور کیلی فورنیا کے آباد ہونے اور چین اور جاپان
کے دروازوں کے کھلنے کے بعد یہ فریضہ اب پورا ہو چکا ہے۔[۱۷]

یورپ کے اہلِ علم مشرق کے معاشرتی حالات سے (یونان اور روما کے قدیم مورّخوں کے ذریعے) یوں تو تھوڑا بہت پہلے بھی واقف تھے لیکن جب تجارتی سرگرمیاں بڑھیں اور مغربی سوداگروں، پادریوں، سفیروں اور سیاحوں کی آمد و رفت شروع ہوئی تو بعض حلقوں میں مشرقی قوموں کی تہذیب، عقائد و افکار اور علم و ادب سے واقفیت کا شوق بھی تیز ہوا۔ چنانچہ سنسکرت، ژند، عربی اور فارسی زبانوں کا کلاسیکی اور مذہبی لٹریچر یورپی زبانوں میں منتقل ہونے لگا۔ سائمن اوکلے نے ۱۷۰۸ء میں عربوں کی مبسوط تاریخ شائع کی۔ جارج سیل نے ۱۷۳۴ء میں قرآن کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ فوریئے نے ۲۳ جلدوں میں مصر کی تاریخ مرتب کی۔ فرانس کے روشن خیال ادیبوں کا تو مشرق اوڑھنا بچھونا ہو گیا۔ والٹیئر (۱۶۹۴ء۔۱۷۷۸ء) نے کینڈیڈ اور دوسرے افسانوں میں جو بے حد مقبول ہوئے اپنے کلیسا دشمن خیالات مشرق کے حوالے سے پیش کیے۔ مان تِس کیو (۱۶۸۹ء۔۱۷۵۵ء) نے 'مکتوباتِ ایران' اور وکٹر ہیوگو نے 'مشرق' اسی زمانے میں لکھے۔ فرانسیسی نوجوان آں کوئے تِل ان پیروں (Anquetil-Inperon) جان پر کھیل کر سورت آیا اور پارسی دستوروں کی مدد سے اوستا کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا (۱۷۵۹ء)۔ سر ولیم جونس نے جو کلکتہ میں کمپنی کے ہائی کورٹ کا جج تھا 'بھگوت گیتا'، 'دھرم شاستر' اور 'السراجیہ' کا ترجمہ کیا۔ اس نے یہ حیرت انگیز انکشاف بھی کیا کہ یورپی زبانیں اور سنسکرت اور فارسی دراصل ایک ہی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں یعنی ان سب کی جڑ ایک ہے (۱۷۸۳ء)۔ اور لسانیات کے جرمن عالم ہرڈر (۱۷۸۴ء) نے یہ دعویٰ کیا کہ دنیا کی سب پرانی تہذیبیں آپس میں جُڑی ہوئی ہیں۔ غرضیکہ اہلِ مغرب مئے مشرق سے خوب خوب لطف اندوز ہوئے۔ ادیبوں کو مشرق پُراسرار رومانوں کا دیس نظر آیا۔ عالموں نے ہندو دھرم، بدھ مت، زرتشتی مسلک اور اسلام کی مقدس کتابوں میں حق کی تلاش شروع کر دی۔ بعض قدامت پرستوں نے (شیلیگل) نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مشرقی مذاہب کے تعاون کے بغیر نہ تو مادیت اور جمہوریت کا زور توڑا جا سکتا ہے اور نہ یورپ کی روحانی احیاء ممکن ہے۔[۱۸]

اس دور کا سب سے بااثر شاعر اور دانش ور گوئٹے (۱۷۴۹ء-۱۸۳۲ء) تھا۔ وہ فارسی ادب کا بڑا دلدادہ تھا اور اس کا محبوب شاعر حافظ تھا۔ اس نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام 'دیوان' رکھا اور المانوی ادب میں نئے رجحان کی داغ بیل ڈالی۔ اس نے لکھا کہ:

'شمال، جنوب اور مغرب کا شیرازہ بکھر چکا ہے، تخت ہل رہے ہیں، سلطنتیں لرز رہی ہیں۔ چلو، پاک و طاہر مشرق کو بھاگ چلیں اور بزرگوں کی روحوں کی زیارت کریں۔'

اسی اثناء میں فرانس میں انقلاب آیا جس کے لیے والٹیئر، روسو، مان تس کیو، دیدرو، اولباخ، ایل وائی تس اور دوسرے روشن خیال اہلِ قلم برسوں سے ذہنی ماحول تیار کر رہے تھے اور سرمایہ دار طبقہ محنت کشوں کو 'آزادی، مساوات اور اخوت' کا واسطہ دے کر اقتدار سے نبرد آزمائی کی دعوت دے رہا تھا۔ انقلابِ فرانس نے ملوکیت، نوابی اور کلیسا کا قلع قمع کر دیا اور یورپ سرمایہ داری نظام کے دور میں داخل ہوا جس کی معیشت، سیاست، سوچ اور سماجی قدریں سب نئی تھیں۔

کارل مارکس (۱۸۱۸ء-۱۸۸۳ء) نے جس وقت ہوش سنبھالا تو انقلابِ فرانس کو شکست ہو چکی تھی اور یورپ میں ہر جگہ جبر واستبداد کا غلبہ تھا لیکن وہ شعور جس کی پرورش انقلاب کے دوران ہوئی تھی بدستور بیدار تھا اور نئے انقلاب کی تیاریوں میں مصروف۔ سرمایہ داری نظام صنعتی انقلاب کے سہارے ترقی کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہا تھا۔ ہر طرف گہما گہمی تھی اور ہر طبقہ حالات کو بدلنے اور بہتر بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ زندگی کا کوئی شعبہ نہ تھا جس میں ترقی کے آثار نمایاں نہ ہوں اور کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جس کو ترقی کے پیمانے سے نہ ناپا جاتا ہو اور جلد ہی وہ وقت آ گیا جب یہ سوچا جانے لگا کہ ترقی اور تبدیلی کیا فقط ان اشیا اور اداروں میں ہوتی ہے جو انسان کی عقل و محنت کا ثمر ہیں یا حیوانات، نباتات اور خود نوعِ انسانی بھی تبدیلی اور ترقی کے قوانین کے تابع ہیں۔ ۱۸۰۹ء میں فرانسیسی سائنس داں لمارک (جو ڈارون کا پیش رو ثابت ہوا) تحقیق و تجربے سے اس نتیجے پر پہنچا کہ اونچے درجے کے حیوانوں نے سادہ قسم کے حیوانوں سے ترقی کر کے موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ انسان کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ چوپایوں کی نسل سے ہے اور بہت طویل مدت میں ارتقا کے مدارج طے کر کے آدمی بنا ہے۔ پودوں میں ماحول کے فرق سے جو تبدیلیاں ہوتی ہیں لمارک نے ان کی نشاندہی بھی کی اور یہ ثابت کیا کہ جانوروں اور

انسانوں میں جسم کے اعضا میں کثرتِ استعمال یا ترکِ استعمال سے جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں وہ نئی نسل میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ لمارک (اور ڈارون) نے اگر انسان کے نوعی ارتقا کا سراغ لگایا تو اسی دوران بشریات کے عالموں نے انسان کے سماجی ارتقا کے قانون بھی دریافت کر لیے۔ کرسٹین ٹامسن ایک فرانسیسی عالم نے ۱۸۳۶ء میں سماجی ارتقا کے تین مدارج متعین کیے اور آلاتِ پیداوار کو ان مدارج کی پہچان قرار دیا۔ اس کے نزدیک پہلا دور پتھر کا تھا جب انسان پتھر لکڑی اور ہڈی کے آلات واوزار استعمال کرتا تھا۔ دوسرا دور تانبے اور کانسی کا تھا اور تیسرا دور لوہے کا جو ابھی تک جاری ہے۔

ترقی کے نشے میں سرشار مغربی مورخ جب مشرق پر نظر ڈالتے تھے تو ان کو ہر طرف جمود ہی جمود نظر آتا تھا۔ وہ یہ تو تسلیم کرتے تھے کہ مشرق کی تہذیبیں بہت پرانی ہیں اور ان کا قدیم ادب بھی قابلِ قدر ہے لیکن ان کا معاشرہ ہزاروں برس سے ایک ہی ڈگر پر چل رہا ہے۔ اس میں گوتم بدھ کے زمانے سے آج تک کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ مثلاً جان سٹورٹ مِل کے باپ جیمز مِل نے جو ہندوستان میں رہ چکا تھا اپنی کتاب 'برطانوی ہند کی تاریخ' (۱۸۱۸ء) میں صاف صاف لکھ دیا تھا اور سکندر اعظم کے ہمسفر مؤرخوں کی عینی شہادتیں پیش کر دی تھیں کہ 'ہندوستانیوں کے طور طریقے، ان کی سوسائٹی اور معلومات چوتھی صدی قبلِ مسیح میں بھی وہی تھیں جو انگریزوں کے وارد ہونے کے وقت تھیں۔ ہیگل نے جیمز مل کی تائید کرتے ہوئے لکھا کہ 'ہندیوں کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ لہٰذا اُن کے حالات سکندر کے ہمسفر مصنفوں ہی سے پتہ چلتے ہیں۔ ہیگل نے چین کو بھی اس زمرے میں شامل کر لیا اور لکھا کہ 'چین کی طرح ہندوستان بھی ایک ہی جگہ پر قائم اور جامد رہا ہے۔'[19] ان مفکروں کے خیال میں سماجی جمود فقط چین یا ہندوستان کا مقدر نہ تھا بلکہ پورا مشرق اس مہلک مرض میں مبتلا ہے۔

جمود کے علاوہ ان دنوں مشرقی ریاستوں کے استبدادی کردار کا بھی بڑا چرچا تھا۔ ایڈم سمتھ سے مالتھس تک اور ہابس سے ہیگل تک ہر صاحبِ فکر 'مشرقی استبدادیت' (Oriental Despotism) کا ذکر بڑی حقارت سے کرتا تھا اور اس کا موازنہ مغرب کی 'روشن خیال' استبدادیت سے کرتا تھا اور فریڈرک اعظم، پیٹر اعظم، ملکہ کیتھرین اور لوئی چہاردہم کی مثالیں پیش کرتا تھا۔ اہلِ مغرب کو یہ تاثر قدیم یونانی مؤرخوں سے ورثے میں ملا تھا اور یہ نتیجہ تھا، پانچویں

صدی قبل مسیح میں لڑی گئی یونان اور ایران کی جنگوں کا جن کی بناء پر ایران کی ہنمانشی سلطنت مغرب کی نظر میں ہمیشہ کے لیے مشرقی استبدادیت کی علامت بن گئی۔ چنانچہ ہیگل (۱۷۷۰ء۔۱۸۳۱ء) مشرق پر لعن طعن کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

'ہندوستان میں انتہا درجے کی من مانی، بداعمال اور ذلت آمیز استبدادیت کا راج ہے۔ چین، ایران، ترکی درحقیقت پورا ایشیا استبدادیت اور بری قسم کی جابریت کا منظر پیش کرتا ہے'۔[۲۰]

الفاظ نہایت سخت سہی لیکن ہیگل کا یہ محاکمہ بے بنیاد تو نہ تھا بلکہ سو سال کے بعد بھی کاغذ کی یہ ٹوپی بیشتر مشرقی حکمرانوں کے سروں پر ٹھیک بیٹھتی ہے۔

اپنے لیکچروں میں تاریخ کے ارتقائی مدارج کا تعین کرتے ہوئے وہ مشرقی ریاستوں کو سب سے نچلی سطح پر رکھتا ہے کیونکہ ان ریاستوں میں فقط ایک شخص آزاد تھا اور وہ تھا مطلق العنان بادشاہ۔ اس سے اوپر یونان اور روما کی قدیم ریاستیں تھیں جن میں 'چند افراد' آزاد تھے اور سب سے اعلیٰ سطح پر جرمن ریاست تھی جو انسان کی 'آزادیٔ مطلق' کا نقطۂ عروج تھی[۲۱] مگر یہ نام نہاد جرمن ریاست ہیگل کے تخیل کی تخلیق تھی۔ ورنہ حقیقت میں ۱۹ویں صدی میں جرمن ریاست اتنی ہی مستبد اور مطلق العنان تھی جتنی قرونِ وسطیٰ کی مشرقی ریاستیں۔ جرمن ریاست کی اسی بے جا مدح سرائی کی بدولت ہیگل کو سرکاری فلسفی کا مرتبہ ملا اور ہٹلر نے بھی اس کو بانس پر چڑھایا۔

تیسرا مسئلہ ملکیتِ زمین کا تھا۔ اس کے بارے میں دانایانِ مغرب میں شدید اختلاف تھا۔ ایک حلقے کا خیال تھا کہ مشرق میں زمین سدا سے ریاست/بادشاہ کی ذاتی ملکیت رہی ہے۔ اس کو اختیار تھا کہ جس کو چاہے زمین برائے کاشت عنایت کردے اور جب چاہے زمین اس سے چھین لے۔ دوسرا گروہ کہتا تھا کہ مشرق کی بابت یہ عام کلیہ درست نہیں کیونکہ بعض مقامات پر بعض وقتوں میں گاؤں کی زمین گاؤں والوں کی مشترکہ ملکیت تصور کی جاتی تھی اور حاکمِ وقت کو ان سے فقط اجتماعی محصول وصول کرنے کا حق تھا۔ اس مسئلے پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے ہیگل نے ایک نہایت اہم نکتے کی جانب اشارہ کیا ہے جس پر ہم مارکس کے ضمن میں تفصیل سے بحث کریں گے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

'ملکیتِ زمین کی حد تک یہ سوال بہت اہم ہے کہ آیا ہندوستان میں

مزروعہ زمین خود کاشتکار کی ملکیت ہے یا نام نہاد نواب کی۔خود انگریزوں کو اس مسئلے کو سمجھنے میں بڑی دشواری پیش آئی ہے۔ ہر گاؤں کی آمدنی دو حصوں میں بانٹی جاتی ہے۔ایک حصہ راجا کا ہوتا ہے اور دوسرا کاشتکاروں کا لیکن قاعدے کے مطابق کچھ حصہ گاؤں کے (پرووسٹ) کھیا، جج، پانی کے نگراں، پنڈت جو مذہبی رسوم ادا کرتا ہے، جوتشی، لوہار، بڑھئی، کمہار، دھوبی، حجام، وید، طوائف، داسی، گویئے اور شاعر کو بھی ملتا ہے۔ یہ انتظام مقرر شدہ ہے۔اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور نہ اس میں کسی شخص کی مرضی دخل اندازی کر سکتی ہے۔ لہٰذا تمام سیاسی انقلابات عام ہندوؤں (اس وقت ہندوستان کے تمام باشندوں کے لیے خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں یہی عام اصطلاح استعمال کی جاتی تھی) کے لیے درخورِ اعتنا نہیں ہوتے کیونکہ ان کی تقدیر میں زندگی جوں کی توں رہتی ہے۔[۲۲]

حوالہ جات

۱۔ ایڈورڈ گبن، *The Decline and Fall of the Roman Empire*، جلد اوّل (لندن، تاریخ ندارد)، ص ۱۶۵

۲۔ ایضاً، ص ۵۴

۳۔ ایضاً، ص ۵۶

۴۔ ایضاً، جلد سوم، ص ۲۱۴

۵۔ فلپ کے۔ حتّی، *History of the Arabs* (لندن، ۱۹۵۹ء)، ص ۱۲۶

۶۔ ایڈورڈ گبن، جلد اوّل، بحوالہ سابقہ، ص ۲۹۷

۷۔ محمد اقبال، *The Development of Metaphysics in Persia* (لاہور، ۱۹۶۴ء)، ص ص ۲۳۔۲۲

۸۔ ملاحظہ ہو، ڈی۔ اولیری، 'فلسفۂ اسلام'، ترجمہ: مولوی احسان احمد (حیدرآباد دکن، ۱۹۴۶ء)، ص ص ۱۔۴۳

۹۔ فلپ کے۔ حتی، بحوالہ سابقہ، ص ۵۲۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۲۸

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۳۱

۱۳۔ ایضاً، ص ص ۵۷۹۔۸۰

۱۴۔ *The Cambridge History of Islam*، جلد اوّل (۲۔بی) (کیمبرج، ۱۹۷۷ء)، ص ص ۸۰۱۔۰۲

۱۵۔ وِل ڈیورانٹ، *The Story of Civilization*، جلد ۴: *The Age of Faith* (نیویارک، ۱۹۵۰ء)، ص ۹۵۶

۱۶۔ کارل مارکس، *Collected Works*، جلد ۶ (ماسکو، ۱۹۷۶ء)، ص ۵۷۴

۱۷۔ کارل مارکس اور اینگلز، *On Colonialism* (ماسکو)، ص ۳۱۸

۱۸۔ ایڈورڈ ڈبلیو۔ سعید، *Orientalism* (نیویارک، ۱۹۷۹ء)، ص ۳۱

۱۹۔ ہیگل، *Philosophy of History* (نیویارک، ۱۹۵۶ء)، ص ۱۲۳

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۸

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۵۴

دوسرا باب

مارکس اور مشرق

(لندن سے پہلے)

مارکس جس وقت (۱۸۳۶ء) برلن یونیورسٹی میں داخل ہوا تو وہاں ہیگل کا طوطی بول رہا تھا حتیٰ کہ وزرا اور بڑے بڑے سرکاری افسر بھی ہیگل کے گُن گا رہے تھے۔ مارکس کے باپ نے جو ایک خوش حال وکیل تھا بیٹے کو یونیورسٹی میں قانون پڑھنے بھیجا تھا مگر مارکس کا ذاتی رجحان فلسفے کی جانب تھا۔ اس نے باپ کی وفات کے بعد قانون کو خیرباد کہا اور فلسفے کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ وہ اس انجمن میں بھی شامل ہو گیا جو بائیں بازو کے ہیگل وادی نوجوانوں نے بنا رکھی تھی۔ اس نے ہیگل کی تصنیفات غور سے پڑھیں۔ ہیگل نے 'فلسفۂ تاریخ' کے لیکچروں میں (جو کتابی شکل میں موجود تھے) بابل و نینوا، مصر، چین، ایران اور ہندوستان کے فلسفے، تاریخ، تہذیب، مذہب اور سیاسی نظام کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا، مارکس اُن سے بھی جیسا کہ اس کی بعد کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے، بخوبی واقف تھا۔ اس نے دیمقراطیس اور ابی قورس کے ایٹمی فلسفوں پر تحقیقی مقالہ لکھا اور ۱۸۴۱ء میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کر لی۔ وہ قدیم یونانی اور لاطینی زبانوں اور ان کے کلاسیکی ادب پر بھی پورا عبور رکھتا تھا۔ لہٰذا ہم یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ مارکس طالب علمی کے زمانے ہی میں مشرق سے کسی حد تک ضرور شناسا ہو چکا تھا۔

مارکس نے علمِ اقتصادیات اور سوشلسٹ نظریات کا مطالعہ دو سال بعد پیرس میں شروع کیا اور اپنی تحقیق سے اس نتیجے پر پہنچا کہ معاشرے کی اصل اس کی اقتصادیات ہوتی ہے اور سیاست، قانون، فلسفہ وغیرہ اس کے بالائی ڈھانچے ہوتے ہیں لہٰذا:

'قانونی رشتوں اور سیاسی ہیئتوں کا پورا پورا شعور نہ تو خود اس کے اپنے

حوالے سے ممکن ہے، نہ انسانی ذہن کے نام نہاد عمومی ارتقا کی بنیاد پر (یہ اشارہ ہیگل کی طرف تھا) بلکہ اس کے برعکس ان رشتوں اور ہیئتوں کا مبداء زندگی کے مادّی حالات ہوتے ہیں۔ ہیگل ان مادّی حالات کے مجموعے کو ۱۸ویں صدی کے انگریز اور فرانسیسی مفکروں کی تقلید کرتے ہوئے 'سول سوسائٹی' سے تعبیر کرتا ہے۔ (دوئمش) یہ کہ اس سول سوسائٹی کی 'اینگ بدّیا، اقتصادیات میں تلاش کرنی چاہیے۔ اقتصادیات کا مطالعہ میں نے پیرس میں شروع کیا اور برسلز (بلجیئم) میں جاری رکھا جہاں مجھ کو موسیو گیزو (وزیرِاعظم فرانس) کے ملک بدری کے احکام کے باعث قیام کرنا پڑا تھا'[1]

مارکس لکھتا ہے کہ 'فریڈرک اینگلز (۱۸۲۰ء۔۱۸۹۴ء) بھی اپنے طور پر اس نتیجے پر پہنچا تھا'۔ یہی ہم خیالی ان کی زندگی بھر کی دوستی کا سبب بنی۔ مارکس اور اینگلز نے پیرس اور برسلز کے قیام کے دوران اپنے فلسفۂ تاریخ اور سوشلسٹ نظریات کی وضاحت میں کئی اہم دستاویزیں تیار کیں۔ 'مقدس خاندان'، 'جرمن آئیڈیالوجی'، 'فلسفے کا افلاس' اور 'کمیونسٹ مینی فیسٹو' اسی زمانے کی یادگار تصنیفیں ہیں۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے مارکس اور اینگلز نے مشرق بالخصوص ہندوستان اور چین کی معیشت پر مغربی سرمایہ داری کے غلبے کے اثرات کا ذکر پہلی بار اپنی مشترکہ تصنیف 'جرمن آئیڈیالوجی' (۱۸۴۶ء) میں کیا۔ انہوں نے اس کتاب میں اپنے تاریخی مادّیت کے فلسفے کی وضاحت اور خیالیوں کے فلسفۂ تاریخ پر تنقید کرتے ہوئے مشرقی ملکوں کی متعدد مثالیں دی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ خیالیوں کی سوچ الٹی ہے۔ وہ خیال کو علّت اور مادّی زندگی کو اس کا مظہر سمجھتے ہیں حالانکہ 'وجود شعور کو متعین کرتا ہے نہ کہ شعور وجود کو'۔ انسانی تاریخ کے محرک معاشرے کے حالاتِ زیست ہوتے ہیں یعنی ضروریاتِ زندگی ــــ خوراک، پوشاک وغیرہ کو پیدا کرنے اور تقسیم کرنے کا طریقہ اور وہ انسانی رشتے جو طریقۂ پیداوار سے مخصوص ہوتے ہیں۔ خیالات اور نظریات، عقائد و اوہام، ریاست، قانون، اخلاقیات اور فلسفہ سب کا سرچشمہ یہی معاشرتی حالاتِ زیست ہوتے ہیں۔ 'مگر تاریخ کی اس حقیقی اساس کو اب تک یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے یا یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ بہت ہی

معمولی باتیں ہیں جن کا تاریخ کے بہتے ہوئے دھارے سے کوئی تعلق نہیں۔[۲]

مارکس اور اینگلز کے نزدیک خیالیوں کی دوسری غلطی یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے عہد کی اصل حقیقت کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہوتی ہیں یہ حضرات ان کو سچ مان لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی عہد اگر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ وہ خالص 'سیاسی' یا 'مذہبی' محرکات کے باعث وجود میں آیا تو خیالی مورخ اس بات کو آنکھ بند کر کے تسلیم کر لیتا ہے۔ اس طرح لوگوں کے گمانِ باطل ہی کو ان کے عمل کا موجب اور فیصلہ کن فعالی قوت سمجھ لیا جاتا ہے۔ مثلاً ذات پات کی تمیز ہندوستانیوں اور قدیم مصریوں میں ریاست اور مذہب کی نافذ کی ہوئی تقسیم کار کی بھونڈی شکل تھی لیکن مورخ سمجھتا ہے کہ ذات پات کا نظام ہی وہ قوت ہے جس نے اس بھونڈے سماجی نظام کو جنم دیا'[۳] مارکس کا روئے سخن ہیگل کی طرف تھا جس نے فلسفۂ تاریخ کے لیکچروں میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ذاتوں کی تقسیم مذہب کی نافذ کردہ ہے۔[۴]

لیکن ذات پات کی بحث سے کہیں زیادہ خیال افروز نوآبادیاتی نظام پر مارکس اور اینگلز کا تبصرہ تھا جو ہم کو ان کی تحریروں میں پہلی بار جرمن آئیڈیالوجی میں ملتا ہے۔ ۱۹ویں صدی میں 'کالونی' یعنی نوآبادیات کی اصطلاح دو معنوں میں استعمال ہوتی تھی۔ اوّل وہ ملک جہاں اہلِ مغرب نے اپنی بستیاں بسائیں اور مقامی باشندوں کو ان کی زمینوں سے زبردستی بے دخل کر کے ملک کے مالک بن گئے جیسے شمالی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ۔ دوئم وہ ملک جن میں اہلِ مغرب آباد نہیں ہوئے بلکہ حاکم بن کر ان کی دولت اور تجارت وصنعت کو اپنے تصرف میں لائے مثلاً برما، ہندوستان، سری لنکا، ملائشیا، الجزائر، ویت نام، سوڈان اور انڈونیشیا وغیرہ۔ تیسرے وہ نیم نوآبادیاتی ملک تھے جو بظاہر آزاد اور خودمختار تھے لیکن ان کی معیشت مغربی طاقتوں کے تابع تھی جیسے چین، مصر اور ایران۔

نوآبادیاتی نظام جس کو مقبوضاتی نظام کہنا شاید زیادہ درست ہو سرمایہ داری نظام کے تجارتی دور کی پیداوار ہے۔ نوآبادیاتی نظام مغربی معیشت اور سیاست پر جس طرح اثر انداز ہوا اس کی تشریح کرتے ہوئے مارکس اور اینگلز لکھتے ہیں کہ:

> 'تجارتی سرمائے کا دور ۱۷ویں صدی کے وسط میں امریکہ میں سونے چاندی (کی کانوں) کی دریافت سے شروع ہوا۔ اور ۱۸ویں صدی کے

آخر تک باقی رہا۔ اس دور میں بین الاقوامی تجارت اور بحری جہاز رانی کا کاروبار مینوفیکچرنگ کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے پھیلا اور مینوفیکچرنگ نے ثانوی کردار ادا کیا۔ مقبوضات میں مال کی کھپت بہت بڑھ گئی اور طویل جدوجہد کے بعد مختلف (مغربی) قوموں نے عالمی بازار کو آپس میں بانٹ لیا۔ اس دور کی ابتدا بحری قوانین اور مقبوضاتی اجارہ داریوں سے ہوتی ہے۔ قوموں کے مابین مقابلے کو ٹیرف، امتناعی قوانین اور معاہدوں کے ذریعے حتی الامکان روکا گیا اور بالآخر اس جدوجہد کا تصفیہ جنگوں بالخصوص بحری جنگوں سے کیا گیا۔ انگریزوں نے جو سب سے طاقتور قوم تھی تجارت اور مینوفیکچر میں اپنی برتری بدستور قائم رکھی۔

'امریکہ اور ایسٹ انڈیز (جنوبی ایشیا) کے بحری راستوں کی دریافت سے مینوفیکچر اور اشیاء بازاری کی عام نقل و حرکت کو بہت فروغ ہوا۔ ان علاقوں سے نئی نئی چیزوں کی درآمد سے بالخصوص سونے اور چاندی کی کثیر مقدار میں گردش سے طبقات کی باہمی حیثیت بالکل بدل گئی۔ نئے دریافت شدہ ملکوں کو آباد کرنے اور ان پر قبضہ کرنے سے (مغربی) قوموں کے مابین تجارتی رقابتوں کو نئی غذا ملی اور نتیجے کے طور پر مقبوضات میں توسیع ہوئی اور دشمنیوں میں شدت آئی۔ تجارت نے سیاسی اہمیت اختیار کرلی'۔[۵]

بحری راستوں کی دریافت اور بین الاقوامی تجارت میں فروغ کے باعث 'قوموں کے درمیان دوری اور بیگانگی' کم ہوگئی اور 'انسانی تاریخ (پہلی بار) تاریخِ عالم بن گئی'۔ سرمایہ داری نظام کی ایک تاریخی اہمیت یہ ہے کہ دنیا ایک اقتصادی وحدت ہوگئی، ایک ایسی زنجیر جس کی سب کڑیاں ایک دوسرے میں پیوست ہوں۔ 'مثلاً کوئی مشین اگر انگلستان میں ایجاد ہوتی ہے تو وہ ہندوستان اور چین کے لاتعداد محنت کشوں سے ان کی روزی چھین لیتی ہے اور ان سلطنتوں کے اندازِ وجود کو الٹ پلٹ کر دیتی ہے۔ اس طرح مشین کی یہ ایجاد عالمی تاریخی حیثیت اختیار کر لیتی ہے'۔[۶]

مارکس نے اپنی دوسری تصنیف 'فلسفہ کا افلاس' میں جو ۱۸۴۷ء میں برسلز کے قیام کے دوران

لکھی گئی تھی اس امید کے راستے بحری تجارت کے فروغ، اشیاء بازاری کی گردش میں اضافے اور نو آبادیاتی نظام کے بارے میں یوں تو وہی باتیں کہیں جن کا ذکر وہ جرمن آئیڈیالوجی میں کر چکا تھا لیکن اس کتاب میں مارکس نے پہلی بار نو آبادیاتی نظام کے استحصالی کردار کی جانب اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

'انگریز مزدوروں کا بڑھتا ہوا معیارِ زندگی ہندوستانی محنت کشوں کو دی جانے والی ہولناک حد تک کم اُجرت کے طفیل ہے انگلستان میں کسی صنعت میں برسرِ کار ساڑھے بارہ لاکھ مزدوروں کی خوشحالی کی قیمت ہے ہندوستان کے کروڑوں مزدوروں کی موت'۔[7]

کمیونسٹ مینوفسٹو کو مارکس اور اینگلز نے جنوری ۱۸۴۸ء میں برسلز ہی میں مرتب کیا۔ یہ شہرۂ آفاق دستاویز (جرمن) کیمونسٹ لیگ کا منشور تھی لہٰذا اس میں بھی مارکس اور اینگلز نے نو آبادیاتی نظام اور چین، ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا کے ساتھ تجارت کا ضمناً تذکرہ کیا ہے۔[8] البتہ مارکس اور اینگلز نومبر ۱۸۴۷ء میں کیمونسٹ لیگ کی دوسری کانگریس میں شرکت کرنے جب لندن گئے تھے تو انہوں نے جرمن ورکرز ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے میں اس موضوع پر تقریریں کی تھیں لیکن فقط اینگلز ہی کی تقریر کا متن دستیاب ہو سکا ہے۔

اینگلز نے امریکہ سے حاصل کی ہوئی سونے چاندی کی دولت اور مشرقی ملکوں سے بحری تجارت کے بارے میں وہی باتیں دہرائیں جو پہلے کہی جا چکی تھیں مگر اس نے خودکار صنعتی مشینوں کے انقلابی کردار سے بحث کرتے ہوئے ایشیا میں ان کے استعمال کے عواقب و نتائج پر بھی روشنی ڈالی اور یہ دعویٰ کیا کہ خودکار مشینوں کے رواج پانے سے مشرق کا صدیوں پرانا جمود ٹوٹ رہا ہے۔

'ہم جانتے ہیں کہ ڈچوں نے انڈونیشیا کو اسی حالت میں پایا تھا جس حالت میں انگریزوں نے ہندوستان کو پایا۔ ہندوستانی صدیوں سے یکساں طور پر زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ کھاتے تھے، پیتے تھے، اولاد پیدا کرتے تھے اور پوتا اسی طرح زمین پر کام کرتا تھا جس طرح دادا کر چکا تھا۔ انقلابات بے شک بہت آئے مگر وہ اقتدار پر قبضہ کرنے کے سوا کچھ نہ تھے اور جب انگریزوں نے قدم جمائے اور اپنی مصنوعات کو پھیلایا تو

ہندوستانیوں کا ذریعۂ معاش بھی ان سے چھن گیا اور ان کی پائیدار زندگی
ہل گئی۔

'یہی حال چین کا ہوا۔ یہ وہ ملک ہے جس نے ہزار برس سے زیادہ مدت
سے ترقی اور تاریخ سے انکار کیا مگر اب اس کی زندگی الٹ پلٹ گئی ہے اور
انگریزوں اور مشینوں نے اس کو (جدید) تمدن کے دائرے میں گھسیٹ لیا
ہے۔

'اب ہر جگہ معاشرہ دو طبقوں میں بٹ گیا ہے لیکن عالمی بازار کے وجود
میں آئے بغیر یہ ممکن نہ تھا۔ اب دُنیا میں محنت کشوں کا مفاد ایک ہے لہٰذا
انقلاب اگر ایک ملک میں آتا ہے تو اس سے دوسرے ملکوں کا متاثر ہونا
ناگزیر ہے۔ حقیقی آزادی کا امکان اب پیدا ہوا ہے۔'[9]

اینگلز نے مشرقی ملکوں کے معاشرتی جمود کے بارے میں وہی کچھ کہا ہے جو اس کے پیش رو مغربی مُفکّر بار بار کہہ چکے تھے لیکن مشرقی معاشرے میں سرمایہ داری نظام کے اثر و نفوذ سے جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں وہ اینگلز کے نزدیک اس وجہ سے اہم نہ تھیں کہ مغرب 'غیر مہذب' ایشیائیوں کو 'تہذیب' سکھانے میں کامیاب ہو رہا ہے بلکہ اینگلز کے پیشِ نظر محنت کشوں کا عالمی اتحاد تھا کیونکہ 'دنیا میں محنت کشوں کا مفاد ایک ہے'۔ ان کی انقلابی جدوجہد ایک دوسرے کو سہارا دے سکے گی اور دنیا صحیح معنی میں آزاد ہو سکے گی۔ مارکس اور اینگلز نے مشرق کے بارے میں آئندہ جو کچھ لکھا اس پر اسی تناظر میں غور کرنا چاہیے۔ یعنی سرمایہ داری نظام کے غلبے کے باعث مشرقی معاشروں میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان سے عوامی انقلاب کے امکانات روشن ہوتے ہیں یا نہیں۔

حوالہ جات

۱۔ کارل مارکس، *A Contribution to the Critique of Political Economy* (ماسکو، ۱۹۷۰ء)، ص ۲۰

۲۔ کارل مارکس، *German Ideology*، مشمولہ *Collected Works*، جلد ۵، (ماسکو، ۱۹۷۶ء)، ص ۵۳

۳۔ ایضاً، ص ۵۵

۴۔ ہیگل، *Philosophy of History*، بحوالہ سابقہ، ص ۱۱۳

۵۔ کارل مارکس، *German Ideology*، بحوالہ سابقہ، ص ص ۱۷۔۶۹

۶۔ ایضاً۔

۷۔ کارل مارکس، *Poverty of Philosophy* (ماسکو، ۱۹۷۶ء)، ص ۱۱۳

۸۔ کارل مارکس، *Collected Works*، جلد ۶، بحوالہ سابقہ، ص ۱۷۹

۹۔ مارکس اور اینگلز، *Collected Works*، جلد ۶، ص ص ۳۹۔۶۱۷

تیسرا باب

مارکس اور مشرقی طریقۂ پیداوار

مارکس لندن میں مستقل سکونت اختیار کرنے (۱۸۵۰ء) سے پیشتر اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ سرمائے کے ارتکاز اور خودکار صنعتی مشینوں کی ایجاد کی بدولت تجارتی سرمایہ داری صنعتی سرمایہ داری کے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ دوئم یہ کہ سرمایہ داری نظام میں پیداوار کا طریقہ تو اجتماعی ہے لیکن پیداوار سرمایہ دار طبقے کی ذاتی ملکیت ہے اور وہی طبقہ دولت آفرینی کے تمام ذرائع، فیکٹریوں، ملوں، بینکوں، جہازوں، ریل گاڑیوں اور زمینوں پر قابض ہے۔ سوئم یہ کہ پیداواری عمل کا یہ تضاد اسی وقت حل ہو سکتا ہے جب پیداوار اور ذرائع پیداوار انہیں لوگوں کی اجتماعی ملکیت بن جائیں جن کی اجتماعی محنت سے دولت پیدا ہوتی ہے۔ چہارم یہ کہ یہ تاریخی کارنامہ محنت کش طبقہ ہی اپنی انقلابی جدوجہد کے ذریعے سرانجام دے سکتا ہے۔ انسان تبھی ہر قسم کے جبر سے آزاد ہو سکے گا اور اس کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع حاصل ہو سکیں گے۔

لندن پہنچ کر مارکس نے سرمایہ داری نظام پر ایک جامع کتاب 'سرمایہ' لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ صبح سویرے برٹش میوزیم چلا جاتا اور شام کو جب لائبریری بند ہونے لگتی تب گھر لوٹتا۔ اسی دوران وہ اخبار 'نیو یارک ڈیلی ٹری بیون' کا نامہ نگار مقرر ہو گیا۔ اپنی ان دنوں کی مصروفیت کا ذکر کرتے ہوئے مارکس لکھتا ہے کہ:

> 'برٹش میوزیم میں علم اقتصادیات کی تاریخ سے متعلق کثیر مواد کی موجودگی، یہ حقیقت کہ لندن کا شہر بورژوا سوسائٹی کے مشاہدے کی نہایت مناسب جگہ ہے اور پھر کیلی فورنیا اور آسٹریلیا میں سونے کی دریافت سے سرمایہ دار سوسائٹی کا نئے ترقیاتی دور میں داخل ہونا وہ محرکات تھے جنہوں نے مجھ

کو کام کی از سرِ نو ابتدا کرنے اور نئے مواد کا احتیاط سے مطالعہ کرنے پر مجبور کیا۔ یہ نیا مطالعہ مجھ کو بہ ظاہر دور از کار موضوعات کی جانب بھی لے گیا اور مجھ کو کچھ وقت ان پر بھی صرف کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ روزی کمانے کی ناگزیر ضرورت کی وجہ سے بھی میں نے اصل موضوع کو کم وقت دیا۔ میں آٹھ سال سے 'نیویارک ڈیلی ٹری بیون' سے وابستہ ہوں جو ایک ممتاز اینگلو امریکی اخبار ہے۔ اس سبب سے بھی مجھ کو اپنے مطالعے کو کئی ٹکڑوں میں بانٹنا پڑا۔ چونکہ میرے بہت سے مضامین کا تعلق برطانیہ اور یورپ کے اہم اقتصادی معاملات سے تھا لہٰذا مجھ کو ان تفصیلات سے بھی واقف ہونا پڑا جو بنیادی طور پر علمِ اقتصادیات کے دائرے سے خارج ہیں'۔[1]

مارکس نے 'نیویارک ڈیلی ٹری بیون' میں جو مضامین 'روزی کمانے' کے لیے لکھے وہ 'ہر چند کہ علمِ اقتصادیات کے دائرے سے خارج' تھے لیکن ان کی تیاری میں اس نے برطانوی پارلیمنٹ کے مباحثوں، سرکاری رپورٹوں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے نوشتوں اور دوسری متعلقہ کتابوں سے معلومات کا جو وافر ذخیرہ جمع کیا اس سے مارکس کو اپنے اقتصادی اور سیاسی نظریوں کی تشکیل و تشریح میں بڑی مدد ملی۔ چنانچہ سماجی ارتقا کے ادوار کا تعین، سرمایہ داری سے قبل کے مشرقی اور مغربی معاشروں کی شناخت، نو آبادیاتی نظام کی جانچ پڑتال کے اصول، مقبوضاتی توسیع اور سرمائے کے ابتدائی ارتکاز کے مابین رشتہ، نو آبادیات میں استحصال کی شکلیں اور طریقے، افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ میں بیرونی سرمائے کے غلبے کا دہرا کردار، مغربی پرولتاریہ کی طبقاتی جدوجہد اور محکوم قوموں کی آزادی کی تحریکوں کا باہمی تعلق، غرضیکہ بے شمار بنیادی مسائل تھے جن پر مارکس اور اینگلز نے 'ڈیلی ٹری بیون' میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

مارکس نے مشرق کے مسائل پر 'نیویارک ڈیلی ٹری بیون' میں ۱۸۵۳ء سے لکھنا شروع کیا۔ اس نے پہلا مضمون چین پر لکھا جہاں دو سال قبل فیوڈل اقتدار کے خلاف زبردست بغاوت ہوئی تھی مگر انگریزی، امریکی اور فرانسیسی فوجوں کی مدد سے کچل دی گئی تھی۔ چند ہی دن بعد اس نے ہندوستان کے حالات پر تبصرہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کمپنی پنجاب، سندھ اور سرحد پر قابض ہو چکی

تھی اور کئی دیسی ریاستوں کو بھی انگریزی عمل داری میں شامل کرلیا گیا تھا۔اس کے علاوہ کمپنی کے چارٹر کی تجدید کا مسئلہ بھی پارلیمنٹ میں زیرِ بحث تھا۔انگلستان کے بااثر حلقوں میں کمپنی کی مخالفت شدت اختیار کرتی جارہی تھی اور مطالبہ ہو رہا تھا کہ کمپنی کا چارٹر منسوخ کر دیا جائے اور ہندوستان کا نظم ونسق براہِ راست تاجِ برطانیہ کے تابع ہوجائے۔

مارکس ان دنوں فرانسیسی سیاح ڈاکٹر فرانکوابرنیئر کا سفرنامۂ ہند پڑھ رہا تھا (برنیئر شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں نو سال تک دہلی میں رہ چکا تھا) اس نے ۲جون ۱۸۵۳ءکو اینگلز کے نام خط میں برنیئر کا یہ قول نقل کیا کہ ہندوستان میں 'بادشاہ ہی بلاشرکتِ غیرے زمین کا مالک ہوتا ہے' اور لکھا کہ 'برنیئر کا یہ خیال درست ہے کہ مشرق میں تمام حقائق کی بنیاد زمین کی حد تک ذاتی ملکیت کا فقدان ہے۔مشرق کے جنت کی کنجی بھی یہی ہے۔'[۲]

اینگلز نے مارکس کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ۶جون ۱۸۵۳ءکو جواب میں لکھا کہ:۔

> 'اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زمین کی حد تک ذاتی ملکیت کا فقدان پورے مشرق کی کنجی ہے۔اس کی سیاسی اور مذہبی تاریخ یہی ہے لیکن ایسا کیوں ہے کہ مشرق والے فیوڈل شکل میں بھی ملکیتِ زمین تک نہ پہنچ سکے۔'

اینگلز کا خیال تھا کہ اس کی وجہ مشرق کی آب و ہوا اور وہ وسیع و عریض خشک علاقہ ہے جو ریگستان صحارا سے تاتار تک پھیلا ہوا ہے اور جہاں مصنوعی آب رسانی کے بغیر زراعت ممکن نہیں۔ لیکن اس کٹھن کام سے مرکزی اور صوبائی حکومتیں ہی عہدہ برآ ہوسکتی ہیں۔[۳]

مگر اس خط و کتابت کے دوران ہی میں مارکس کو پارلیمانی کمیٹی (۱۸۱۰ء) کی رپورٹ اور لیفٹیننٹ کرنل مارک وِلکز کی تصنیف Historical Sketches of South India (جنوبی ہندوستان کے تاریخی خاکے) پڑھنے کو مل گئی۔ پارلیمانی کمیٹی تمام موافق اور مخالف شہادتوں کی چھان بین کے بعد اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ ہندوستان میں میراث دار زمین پر ملکیت کا مستحق ہے۔ کمیٹی نے کنڑا اور ملابار کے علاقوں کو جو مغلوں کے کبھی زیرِ اقتدار نہ رہے تھے بطور سند پیش کیا تھا البتہ یہ رائے ظاہر کی تھی کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی حکومت رہی وہاں کاشتکار حقِ ملکیت سے محروم ہوگئے۔لیکن مارکس نے کرنل وِلکز کے ذاتی مشاہدات کو زیادہ وقعت دی اور اپنی سابقہ رائے کو بدلتے ہوئے اینگلز کو ۱۴جون کے خط میں لکھا کہ:

'بعض دیہاتوں میں گاؤں کی زمینوں کی کاشت مشترکہ ہوتی ہے مگر بیشتر صورتوں میں ہر دخیلکار اپنا کھیت خود جوتتا ہے..... بنجر زمین مشترکہ چراگاہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ گھریلو کتائی اور بُنائی بیویاں اور بیٹیاں کرتی ہیں۔ اس قسم کی سادہ و دلکش ری پبلکیں قریب قریب مکمل شکل میں ہندوستان کے شمال مغربی حصوں میں (پاکستان) جن پر انگریزوں نے حال ہی میں قبضہ کیا ہے اب بھی موجود ہیں ..... بالی میں جو جاوا کے مشرقی ساحل سے دور ایک جزیرہ ہے، یہ ہندوستانی ادارہ معہ ہندو مذہب کے اب بھی قائم ہے اور دوسرے ہندوستانی اثرات کی مانند اس ادارے کے آثار پورے جاوا میں بھی ملتے ہیں۔

'جہاں تک ملکیت کا سوال ہے، یہ مسئلہ ہندوستان کے بارے میں لکھنے والے انگریزوں کے مابین ہنوز بڑا نزاعی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دریائے کرشنا کے جنوب میں پہاڑی علاقے میں ملکیتِ زمین موجود تھی۔ اس کے برعکس جاوا کا سابق انگریز گورنر سر اسٹین فورڈ ریفلز (Sir Stanford Raffles)، اپنی کتاب 'تاریخ جاوا' میں لکھتا ہے کہ بادشاہ اس اراضی کا مکمل طور پر مالک تھا جس سے لگان وصول ہوسکتا تھا۔ بہر حال یوں لگتا ہے کہ مسلمانوں نے پہلی بار پورے ایشیا میں 'عدم ملکیت زمین کا اصول متعین کیا'۔[۴]

خط چونکہ ذاتی تھا لہٰذا مارکس نے کرنل وِلکنز کا حوالہ دینے کی ضرورت نہ سمجھی حالانکہ خط کی ابتدائی تین سطریں وِلکنز کے مشاہدات پر مبنی ہیں۔ وِلکنز نے لکھا تھا کہ:

'بعض جگہوں پر گاؤں کی کاشت مشترکہ ہوتی ہے اور فصل کو محنت کی مناسبت سے تقسیم کرلیا جاتا ہے لیکن عموماً ہر دخیلکار اپنا کھیت خود جوتتا ہے'۔[۵]

لیکن مارکس نے یہی خیال جب کتابی صورت میں پیش کیا تو کرنل وِلکنز کی کتاب کا باقاعدہ حوالہ دیا اور لکھا کہ:

'ہندوستان کی مختصر اور انتہائی قدیم جمعیتیں جن میں سے کچھ آج بھی
موجود ہیں زمین کے مشترکہ قبضے اور زراعت اور دستکاری کے امتزاج اور
ناقابلِ تغیر تقسیم کار پر مبنی ہیں'۔[٦]

البتہ مارکس کا یہ قیاس کہ 'مسلمانوں نے پہلی بار پورے ایشیا میں عدم ملکیت زمین کا اصول رائج کیا' درست نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کرۂ ارض کے دوسرے خطوں کی مانند ایشیا میں بھی زراعت کے ابتدائی دنوں میں گاؤں کے سب لوگ مل جل کر کھیتی باڑی کرتے تھے۔ یہ لوگ عموماً ایک ہی قبیلے یا برادری سے تعلق رکھتے تھے اور گاؤں کی زمین ان کی مشترکہ ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ زمین کی کوئی قدر تبادلہ نہ تھی لہٰذا اس کی خرید و فروخت کا سوال ہی نہ تھا مگر طبقات کے وجود میں آنے اور ریاستوں کے قائم ہونے کے بعد حالات بدل گئے۔ ریاست اپنی قوتِ قاہرہ کے بل پر رعایا کی فاضل قوتِ محنت اور فاضل پیداوار پر قابض ہو گئی اور زمین اصولی طور پر حاکمِ وقت کی ملکیت قرار پائی۔ حاکمِ وقت کو اختیار تھا کہ امراء سلطنت یا عبادت گاہوں کو جتنا علاقہ چاہے بطور انعام عطا کر دے۔ عہدِ قدیم میں مصر، شام، ایشیا کوچک، عراق، ایران غرضیکہ ہر جگہ یہی طریقہ رائج تھا۔ بنی اُمیہ اور بنی عباس بھی اسی اصول پر کاربند رہے۔ چنانچہ سلجوقیوں کا مشہور وزیر نظام الملک طوسی کے بقول 'سلطنت اور رعیت سب سلطان کی ملکیت ہے...... جاگیرداروں کو جو مختلف جاگیروں پر قابض ہیں جان لینا چاہیے کہ ان کو رعایا پر اس کے سوا اور کوئی اختیار نہیں کہ محاصل جن کی وصولی کے وہ ذمہ دار ہیں رعایا سے بطرزِ احسن وصول کریں'۔[٧]

یہ اصول کہ زمین راجہ/ریاست کی ملکیت ہے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے ہزاروں برس پہلے رواج پا چکا تھا، مسلمانوں کی ایجاد بندہ نہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے مشہور مورخ آنجہانی کوسامبی، موریا عہد کے یونانی سفیر میگاستھنیز اور کوٹلیا کی کتاب 'ارتھ شاستر' کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

'یونانی یہ سوچنے میں حق بہ جانب تھے کہ تمام زمین ریاست یا حاکمِ وقت
کی ملکیت تھی'۔ راجا پورے پورے گاؤں مندر کے پنڈتوں کو مفت عطا
کر دیتے تھے بلکہ ساتویں صدی عیسوی کی بعض تانبے کی لوحوں پر تو

مخصوص آراضیوں کا ذکر بھی ہے۔ البتہ ایک خصوصیت بدستور باقی تھی وہ یہ کہ کسی گاؤں کے معطیوں کو بس وہی حقوق ملتے تھے جو عام حالات میں ریاست کو حاصل تھے یعنی وہ فقط مروّجہ محصولات ہی وصول کر سکتے تھے۔ ان کو محصولات میں اضافے کا اختیار نہ تھا اور نہ ان کو زمین اور مویشیوں پر مالکانہ حق مل جاتا تھا۔ ارتھ شاستر کے مطابق زمین پر ریاست کی ملکیت کا حق قائم رہتا تھا'۔[۸]

پروفیسر کوسامبی کی رائے میں 'موریا عہد کے پیداواری عمل کی بنیاد افتادہ زمینوں، جنگلوں اور دلدلوں کی زمینوں کو استعمال میں لانے پر تھا۔ ان زمینوں کو صاف کر کے قابلِ کاشت بنانے کی ذمہ داری سرکاری ملازمین کی تھی[۹] ان زمینوں پر شودر یعنی پست قوموں کے افراد کو لا کر بسایا جاتا تھا اور یہ زمینیں راجا کی ذاتی ملکیت ہوتی تھیں (خالصہ کی زمینیں)'[۱۰]

آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس دور میں زمین کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یعنی زمین کو خریدنے اور بیچنے کے حق کا۔ کیونکہ کھیت پر قبضہ یعنی کاشت کرنے کا حق برادری کی رکنیت سے مشروط تھا۔ ایسی صورت میں کوئی کاشتکار اپنی زمین بیچ کیسے سکتا تھا۔ البتہ راجا کے واجبات ادا کرنے لازمی تھے۔ یہ صورتِ حال تقریباً مغلیہ عہد کے آخر تک موجود رہی'[۱۱]

ڈاکٹر رومیلا تھاپڑ کا خیال ہے کہ 'موریا عہد میں حاکمِ وقت (راجا) کا زمین پر حقِ ملکیت تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن چھوٹے پیمانے پر افراد بھی زمین کے مالک ہوتے تھے۔ خواہ وہ خود کاشت کرتے تھے یا مزارعوں کے ذریعے'۔[۱۲]

مسلمانوں کی آمد سے قبل یعنی ساتویں آٹھویں صدی میں ہم کو تین قسم کی زمینیں ملتی تھیں۔

۱۔ غیر مزروعہ افتادہ زمین جو ریاست کی ملکیت ہوتی تھی اور سرکاری ملازمین کو بطور انعام دی جاتی تھی تا کہ وہ ان کو قابلِ کاشت بنائیں۔

۲۔ خالصہ کی زمین جو زیرِ کاشت تھی۔

۳۔ افراد کی ذاتی ملکیت۔ مزروعہ زمین اگر کسی کو انعام دی جاتی تو معطی کاشتکاروں کو بے دخل کرنے کا مجاز نہ تھا۔ بس پیداوار کا حصہ لے سکتا تھا جو ۳/۱ یا ۲/۱ ہوتا تھا'۔[۱۳]

مغلوں کے عہد میں جاگیری نظام عروج پر تھا اور منصب داروں کو بڑے بڑے علاقے بطور

جاگیر عطا ہوتے تھے مگر یہ جاگیریں ان کی ذاتی ملکیت تصور نہیں کی جاتی تھیں اور منصب دار کے تبادلے یا موت کی صورت میں جاگیر دوبارہ ریاست کو منتقل ہو جاتی تھی۔ بقول ڈاکٹر عرفان حبیب 'ان کا حقِ ملکیت صرف پیداوار میں ایک حصے تک محدود تھا۔ زمین پر ملکیت کا حق نہ تھا'۔[۱۴]

لیکن سرمایہ داری نظام کی بنیاد ذرائع پیداوار...... زمین، فیکٹری، بینک وغیرہ کی ذاتی ملکیت پر ہے۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو جب بنگال، بہار اور اُڑیسہ کی دیوانی کے حقوق ملے تو ان علاقوں کے زرعی نظام کو سرمایہ دارانہ تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا سوال اٹھا۔ اس وقت کمپنی اور اس کے عہدے دار تین ذریعوں سے دولت سمیٹ رہے تھے۔ (۱) مالیہ یا مالگذاری (۲) نمک اور افیون کی تجارت کی اجارہ داری اور (۳) چنگی یا سائر۔ مگر کمپنی کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ زرعی محصولات تھے چنانچہ ایک اندازے کے مطابق فقط بنگال سے ۱۷۵۷ء اور ۱۷۸۰ء کے درمیان ۳ کروڑ اسّی لاکھ پونڈ (جو آج کل کے ۴/ارب پونڈ سے بھی زیادہ ہوں گے) صرف مالیے سے برطانیہ منتقل ہوا۔[۱۵]

وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل نے مغلوں کے اس اصول کی آڑ لے کر کہ زمین حاکمِ وقت کی ملکیت ہوتی ہے ۱۷۷۲ء میں تینوں صوبوں کی دیہی آراضی کو نیلام پر چڑھا دیا اور جس نے بڑھ کر بولی دی زمین اس کے حوالے کر دی البتہ یہ بندوبست فقط پانچ سال کے لیے تھا۔ کاشتکار زمین سے بے دخل ہو گئے اور خوش حال زمینداروں اور ساہوکاروں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا جس کو پہلی بار زمین پر مالکانہ حقوق حاصل ہوئے۔ لوٹ مار کا یہ طریقہ ناکام ہوا تو نیلام کے ذریعے مالیہ کا تخمینہ سال بہ سال ہونے لگا۔

اس روز روز کی نیلامی نے زرعی معیشت کو تباہ و برباد کر دیا اور کمپنی کے اعلیٰ عہدے دار مسئلے کا مستقل حل تلاش کرنے پر مجبور ہو گئے مگر ان میں اتفاقِ رائے نہ تھا۔ سر جان شور اور اس کے ہم نواؤں کا کہنا تھا کہ زمین کے اصل مالک کاشتکار ہیں اور ان پر فقط مالیہ ادا کرنے کی ذمّے داری عائد ہوتی ہے۔ اس کے برعکس سر چارلس گرانٹ کا موقف تھا کہ زمین کی حقیقی مالک حکومتِ وقت ہے اور اس کو پورا حق ہے کہ جس شرط پر چاہے زمین کا تصفیہ کر لے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مالکوں نے سر جان شور کی تائید کی اور گورنر جنرل لارڈ کارنوالس کو ہدایت کی کہ وہ زمینداروں سے معاملہ کر لے۔

لارڈ کارنوالس نے ۱۷۹۳ء میں استمراری بندوبست نافذ کیا۔ اس کے تحت زمینیں مقررہ مالگذاری کے عوض زمینداروں کو ہمیشہ کے لیے دے دی گئیں۔ کارنوالس اور سر جان شور کی دلیل یہ تھی کہ زمینداروں کو مستقل مالکانہ حقوق دینے سے زرعی پیداوار میں اضافہ ہوگا اور وہ اپنی زمینوں کو ترقی دینے اور غیر مزروعہ زمینوں کو زیرِ کاشت لانے کی بے خوف وخطر کوشش کریں گے۔ کمپنی کی یہ توقعات تو پوری نہ ہوئیں البتہ کسان طبقہ زمینداروں کا غلام بن گیا۔ زمیندار جتنا لگان چاہتا وصول کرتا اور جب چاہتا کسانوں کو بے دخل کر دیتا۔ وہ قبضے کے حق سے بھی محروم ہو گئے۔

مگر جنوبی ہند کے حالات مختلف تھے۔ مثلاً شمالی سرکار میں میراث داروں کو پشتہا پشت سے ملکیتِ زمین کا حق حاصل تھا اور ان کے ممتاز افراد گاؤں کے نمائندے تسلیم کیے جاتے تھے لہٰذا اس علاقے میں کمپنی نے گاؤں کے مالیے کی وصولی میراث داروں کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دی۔ لیکن بارہ محل کے علاقے میں جس پر کمپنی نے ۱۷۹۲ء میں قبضہ کیا تھا یہ فریضہ گاؤں کے مکھیا کے سپرد ہوا جو ہر کاشتکار سے فرداً فرداً مالیہ وصول کرتا تھا۔ اس مروّجہ زرعی نظام کی جانچ پڑتال سر تھامس منرو اور الکزانڈر ریڈ نے کی اور رعیت داری بندوبست نافذ کیا۔ اس کے مطابق نصف فصل کو بطور مالیہ حکومت کا حصہ قرار دیا گیا۔ مگر کاشتکار نہ بے دخل ہو سکتا تھا نہ اس کے مالیے میں اضافہ کیا جا سکتا تھا۔ یہی رعیت داری بندوبست رفتہ رفتہ صوبہ بمبئی میں سر ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن نے رائج کیا۔

لیکن برطانیہ کا ایک بااثر حلقہ رعیت داری بندوبست سے مطمئن نہ تھا۔ چنانچہ جان اسٹورٹ مِل کے باپ جیمز مِل نے جو ہندوستان میں رہ چکا تھا، اپنی کتاب 'تاریخِ ہند' میں اس فیصلے پر کڑی نکتہ چینی کی اور لکھا کہ بادشاہ کا حقِ ملکیت ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ایران، چین اور جاوا غرضیکہ تمام مشرقی ملکوں میں تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ اس کے برعکس مؤرخ الفنسٹن کا موقف تھا کہ گاؤں کے کاشتکاروں کا حقِ ملکیت بہت پرانا ہے البتہ یہ حق وہ اجتماعی طور پر استعمال کرنے کے مجاز تھے، انفرادی طور پر کاشتکاروں کو اپنی زمین پر فقط قبضے کا اختیار تھا، ملکیت کا حق نہ تھا'[۱۶] مگر جیمز مِل کی رائے مستند مانی گئی اور ۱۹ ویں صدی کے وسط میں مالتھس، رچرڈ جونیز اور جان مِل سب نے اس کی تائید کی۔

ملکیتِ زمین کے متعلق مارکس کے خیالات ۱۸۵۳ء اور ۱۸۵۸ء کے درمیان کئی بار بدلے۔ اس کا پہلا ردِعمل یہ تھا کہ مملکت کی زمین کا واحد مالک بادشاہ ہوتا تھا (۲ جون ۱۸۵۳ء) لیکن

۱۴ جون کے خط میں اس نے پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ کے حوالے سے یہ قیاس آرائی کی کہ 'عدم ملکیتِ زمین کا اصول ایشیا میں مسلمانوں نے رائج کیا۔ مگر ساتھ ہی کرنل وِلز اور اِلفنسٹن کی تائید کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ بعض جگہوں پر زمین کی کاشت مشترکہ ہوتی ہے البتہ اس وقت تک وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ زمین کا اصل مالک کون ہے۔ حاکمِ وقت یا کاشتکار، کیونکہ ہندوستان اور جاوا میں دونوں کی مثالیں موجود تھیں۔ لیکن ۱۳ اپریل ۱۸۵۸ء کے خبرنامے میں وہ بڑے اعتماد سے دعویٰ کرتا ہے کہ 'بہرحال ہندوستان میں زمین حکومت کی ملکیت نہ تھی، اس کے بیشتر حصے اتنے ہی ذاتی ملکیت تھے جتنے انگلستان میں، بہت سے دیسیوں کے پاس حقِ مالکانہ کی سندیں چھ سات سو برس پرانی ہیں'۔ اس کے بقول پہاڑی علاقوں میں تو ہر ایکڑ زمین کے مالکانہ حقوق موجود تھے۔

اسی اثناء میں لارڈ کیننگ وائسرائے ہند نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں شرکت کی پاداش میں پورے اودھ کی زمین بحقِ سرکار ضبط کرلی اور اعلان کیا کہ 'صوبہ اودھ کی جملہ آراضی کا حقِ ملکیت برطانوی حکومت کو حاصل ہے اور وہ جس طرح مناسب سمجھے گی اس حق کو استعمال کرے گی'۔ مگر لارڈ کیننگ کے اس فیصلے کی اودھ کے چیف کمشنر سر جیمز اوٹرم اور وزیرِ ہند دونوں نے مخالفت کی اور مارکس نے بھی ۲۸ مئی ۱۸۵۸ء کے خبرنامے میں 'انگریزوں کے اس عیارانہ اور سفاکانہ طرزِ عمل' پر کڑی نکتہ چینی کی۔

ملکیتِ زمین کے بارے میں مارکس کی آخری اور فیصلہ کن رائے وہ تھی جس کا اظہار اس نے ۷ جون ۱۸۵۸ء کے خبرنامے میں کیا۔ اس خبرنامے کا تعلق بھی لارڈ کیننگ کے اعلان ہی سے تھا۔ چنانچہ مارکس نے لکھا کہ:

> 'اس اعلان سے ملکیتِ زمین کی پرانی نزاع ایک بار پھر بحث و تمحیص کا موضوع بن گئی ہے۔ اس نزاع کا اصل نکتہ یہ ہے کہ ہندوستان کے اقتصادی نظام میں نام نہاد زمینداروں، تعلقہ داروں اور سرداروں کی حقیقی پوزیشن کیا ہے۔ کیا ان کو سچ مچ زمین کا مالک تصور کیا جائے یا وہ فقط ٹیکس (محصول) وصول کرنے والے تھے؟'

مارکس کہتا ہے کہ فریقین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ 'ہندوستان اور بیشتر ایشیائی ملکوں میں زمین انجام کار حکومت کی ملکیت ہوتی ہے' لیکن ایک فریق اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ 'زمین کی واحد مالک

حکومت ہے جو کاشتکاروں کو زمین کرائے (بٹائی) پر دیتی ہے' لہٰذا وہ جب چاہے کرایہ دار کو زمین سے بے دخل کرنے کی مجاز ہے۔ دوسرا فریق کہتا ہے کہ 'ریاست کا حقِ ملکیت محض ایک اصولی مفروضہ ہے جو دنیا کے سب ملکوں میں فقط نظریاتی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے مگر اس کی حیثیت اقتدارِ اعلیٰ سے مشتق قبالے سے زیادہ نہیں ہے' حکومت صرف ٹیکس عائد کرنے اور وصول کرنے کی مجاز ہے۔ غرضیکہ سوال یہ تھا کہ کاشتکار جو رقم/جنس ادا کرتا ہے وہ کرایہ (rent) ہے یا محصول (tax)؟ کرایہ وہ رقم ہے جو کرایہ دار کسی غیر منقولہ جائیداد ــــ مکان، دُکان، فیکٹری یا زمین کو استعمال کرنے کے عوض جائیداد کے مالک کو ادا کرتا ہے۔ اس صورت میں جائیداد کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ کرایہ دار کو جب چاہے بے دخل کر دے۔ اس کے برعکس محصول وہ رقم ہے جو جائیداد کا مالک حکومت یا دوسرے کسی تسلیم شدہ ادارے کو ادا کرتا ہے۔ اگر کاشتکار کو فقط کرایہ دار قرار دیا جائے، جیسا کہ فریقِ اوّل کا دعویٰ تھا، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زمین پر اس کا کوئی حق نہیں۔ البتہ جو رقم کاشتکار ادا کرتا ہے اس کو اگر محصول تصور کیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ زمین کا مالک کاشتکار ہے۔

مارکس لکھتا ہے کہ اگر فریقِ ثانی کی یہ بات مان لی جائے کہ 'ہندوستان میں آراضیاں ذاتی ملکیت ہیں جن پر نجی قبضے کے قبالے اتنے ہی مستند اور قوی ہیں جتنے دوسرے ملکوں پر نجی قبضے کے قبالے، تب یہ سوال اٹھتا ہے کہ آراضیوں کے حقیقی مالک کون ہیں' تعلقہ دار اور زمیندار جواب دیتے ہیں کہ اصل مالک ہم ہیں۔ 'یہ وہ طبقہ ہے جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو یورپ میں صاحبِ زمین اُمرا اور رؤسا کو حاصل ہے۔ وہ زمین کے حقیقی مالک ہوتے ہیں البتہ حکومت کو واجبات ادا کرتے ہیں اور ان لوگوں کو جو زمین جوتتے بوتے ہیں اپنی مرضی سے بے دخل کرنے کے مجاز ہیں۔ اس دعوے کے مطابق کاشتکاروں کی حیثیت فقط مزارعوں کی ہو جاتی ہے اور زمینداران سے جو کرایہ طلب کرے وہ اس کو ادا کرنے پر مجبور ہیں'۔ یہ دعویٰ انگریزوں کی ملکی روایت اور مزاج کے عین مطابق تھا۔ 'ان کے نزدیک رئیسوں کی بڑی اہمیت اور افادیت ہے کیونکہ وہ سماجی عمارت کے ستون ہوتے ہیں'۔ اس خیال کے پیشِ نظر بنگال میں استمراری بندوبست نافذ کیا گیا' حالانکہ بہتوں کی رائے ہے کہ اس بندوبست سے حکومت اور حقیقی کاشتکار دونوں سے بڑی ناانصافی ہوئی۔'

ریاست کو اقتدارِ اعلیٰ کا مرکز ہونے کی حیثیت سے نظریاتی اور اصولی طور پر جو حقِ ملکیت حاصل ہے مارکس اس کو تسلیم کرتا ہے لیکن زمینداروں اور تعلقہ داروں کے حقِ ملکیت کو وہ نہیں مانتا۔ ہندوستانی اداروں کے گہرے مطالعے سے اور بنگال کے بندوبست سے جو سماجی اور سیاسی خرابیاں پیدا ہوئیں ان کے پیش نظر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ:

'ہندوستان کے ابتدائی اداروں میں زمین کی مالک دیہی جمعیتیں (corporations) ہوتی تھیں۔ وہی افراد کو کاشت کی خاطر زمین الاٹ کرنے کی مجاز تھیں جب کہ زمیندار اور تعلقہ دار ابتدا میں فقط حکومت کے عہدے دار ہوتے تھے جن کا کام گاؤں کے واجبات وصول کرنا تھا۔'

البتہ جب کبھی مرکزی حکومت کمزور ہوئی اور ملک میں طوائف الملو کی پھیلی تو زمیندار اور تعلقہ دار زمین کے مالک بن بیٹھے۔

مارکس کی یہ رائے کہ مشرق کے قدیم معاشرے میں گاؤں کی زمین گاؤں والوں کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھی، ٹھوس تاریخی شہادتوں پر مبنی تھی۔ مثلاً مورّخ اِلفنسٹن نے اپنی کتاب 'مملکتِ کابل کے حالات' (An Account of the Kingdom of Caubul) میں لکھا تھا کہ یوسف زئی اور دوسرے افغان قبیلوں میں زمین پورے قبیلے کی مشترکہ ملکیت خیال کی جاتی ہے اور اس کو مقررہ مدت پر خاندانوں میں ازسرِنو تقسیم کر دیا جاتا ہے (۱۸۱۱ء) خان عبدالغفار خان نے راقم کو ساہیوال جیل میں بتایا تھا کہ ان کی جوانی میں ۱۹ ویں صدی کے اواخر تک، سرحد میں یہ رواج عام تھا اور زمینیں ہر تیس برس پر ازسرِنو تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ سنتے ہیں کہ سوات کے بعض علاقوں میں اب تک اس پرانی روایت پر عمل ہوتا ہے۔ اِلفنسٹن 'تاریخ ہند' (۱۸۴۱ء) میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ہندوؤں کے عہد میں زمین کی مشترکہ ملکیت زرعی نظام کے معمولات میں تھی۔

مگر مارکس کی توجہ کا اصل مرکز مشرقی معاشروں کا سماجی اور اقتصادی جمود تھا۔ وہ اس جمود سے متعلق ہیگل، ایڈم اسمتھ اور دوسرے دانایانِ مغرب کے خیالات سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے ۷ جون ۱۸۵۳ء کے خبرنامے میں سر چارلس وُوڈ کی تقریر کا یہ اقتباس نقل کیا تھا کہ 'ہندوستان میں ایسی نسل کے لوگ آباد ہیں جو تبدیلی کے معاملے میں بڑے سست ہیں اور مذہبی تعصبات اور فرسودہ رسوم میں گرفتار ہیں۔ حقیقت میں یہی باتیں ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں'۔ مارکس

نے جمود کی اس توجیہہ (نسلی پس ماندگی اور مذہبی توہم پرستی) پر طنز کرتے ہوئے لکھا تھا کہ 'شاید ہندوستان میں بھی ٹھگوں کی کوئی ملی جلی حکومت قائم ہے۔'

مارکس یہ جاننا چاہتا تھا کہ مشرقی معاشرہ اگر صدیوں سے کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی محور پر گھوم رہا ہے تو اس کے اسباب وعوامل کیا ہیں اور کیا وجہ ہے کہ مشرق کے فیوڈل نظام نے یورپ کی مانند سرمایہ دارانہ نظام کی جانب ترقی نہیں کی، نہ مشرق کی دستکاری صنعت (مینوفیکچرنگ) صنعتی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ مارکس کی نظر میں اس جمود کا ذمے دار ایشیا کا دیہی نظام تھا۔

مارکس سماجی جمود اور دیہی نظام کے باہمی رشتے پر ہندوستان کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ۱۰ جون ۱۸۵۳ء کے خبرنامے میں لکھتا ہے کہ:۔

> 'ہندوستان میں واقع ہونے والی خانہ جنگیاں، حملے، انقلابات، فتوحات اور قحط بظاہر حیرت انگیز حد تک پیچیدہ، تیز رفتار اور تباہ کن دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کے اثرات سطح سے نیچے کبھی نہ اترے..... ہندوستان کے ماضی کا سیاسی پہلو خواہ کتنا ہی تغیر پذیر کیوں نظر نہ آتا ہو لیکن اس کی سماجی حالت قدیم سے قدیم تر زمانے سے ۱۹ویں صدی کی پہلی دہائی تک بالکل جوں کی توں رہی ہے...... کرگہ اور چرخا جو کاتنے اور بُننے والوں کا مسلسل انبوہ پیدا کرتے ہیں اس سوسائٹی کا محور رہے ہیں۔'

مارکس کے خیال میں اس سماجی نظام کے دو پہلو تھے۔ اوّل 'تمام مشرقی ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی تعمیراتِ عامہ کے بڑے بڑے کام (آبپاشی کا نظام) جو زراعت اور تجارت کی بنیادی شرط تھے مرکزی حکومت کے سپرد تھے'۔ دوسرے 'ملک کی آبادی چھوٹے چھوٹے مرکزوں میں بکھری ہوئی تھی اور وہاں پر زراعت اور گھریلو صنعت آپس میں ملی جلی تھیں۔ ان دو حالات نے زمانۂ قدیم سے ایک ایسے مخصوص سماجی نظام کو جنم دیا جس کو نام نہاد دیہی نظام کہتے ہیں۔ اس نظام کی بدولت ان مختصر جمعیتوں کو آزاد تنظیم اور مخصوص زندگی نصیب ہوئی۔'[۱۷]

اس کے بعد مارکس ہندوستان کے دیہاتوں کی سماجی زندگی کے بارے میں برطانوی پارلیمنٹ کی رپورٹ (۱۸۱۰ء) سے ایک طویل اقتباس نقل کرتا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق ہر گاؤں کے اپنے عہدے دار اور پیشہ ور افراد ہوتے تھے۔ مثلاً گاؤں کا مکھیا یا پٹیل، پٹواری،

چوکیدار، نیر گنتی (آبپاشی کا پانی تقسیم کرنے والا)، جوتشی، بڑھئی، لوہار، کمہار، دھوبی، حجام، مدرس، مولوی یا پنڈت وغیرہ...... 'اس سیدھی سادی میونسپل حکومت کے تحت گاؤں کے لوگ نامعلوم مدت سے زندگی بسر کرتے آئے ہیں۔ گاؤں کی سرحدوں پر شاذ و نادر تبدیلی ہوئی ہے۔ ہرچند کہ گاؤں بعض اوقات جنگ، قحط اور وباؤں کا شکار ہوئے، لیکن وہی نام، وہی سرحدیں، وہی مفادات، یہاں تک کہ وہی خاندان صدہا سال سے بدستور موجود ہیں۔ دیہاتیوں کو اس کی غرض نہیں ہوتی کہ بادشاہتیں ٹوٹتی یا بنتی ہیں۔ اگر گاؤں سلامت ہے تو ان کو اس کی فکر نہیں کہ وہ کس کے پاس منتقل ہوتا ہے یا کس بادشاہ کے قبضے میں جاتا ہے۔ گاؤں کی داخلی معیشت جوں کی توں رہتی ہے۔' ان خاندانی جمعیتوں کا دارومدار گھریلو صنعت پر تھا جس میں ہاتھ سے کتائی، بنائی اور ہاتھ سے کاشتکاری شامل تھی اور جو ان جمعیتوں کو خود کفالت کی طاقت فراہم کرتی تھی۔ [۱۸]

سماجی جمود کے علاوہ یہ دیہی نظام مارکس کے بقول مشرقی استبدادیت کی بنیاد بھی تھا۔ 'ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ یہ دلکش دیہی جمعیتیں دیکھنے میں خواہ کتنی بے ضرر معلوم ہوتی ہوں لیکن ہمیشہ سے مشرقی استبدادیت کی ٹھوس بنیاد رہی ہیں۔ انہوں نے انسانی ذہن کو تنگ ترین دائروں میں محصور کر دیا اور توہمات کو بے چون و چرا قبول کرنے کا آلہ بنا دیا اور لوگوں کو روایتی قیود کی غلامی میں پھنسا کر تمام عظمتوں اور تاریخی توانائیوں سے محروم کر دیا'۔ [۱۹]

مارکس نے گاؤں کی جامد زندگی سے متعلق جن خیالات کا اظہار ۱۰ جون کے خبرنامے میں کیا تھا انہیں کو ۱۴ جون ۱۸۵۳ء کو اینگلز کے نام خط میں دہرایا اور آخر میں لکھا کہ:

> 'یہ دلکش ری پبلکیں جو اپنے گاؤں کی سرحدوں کی حفاظت بڑی مستعدی سے کرتی ہیں، بڑی حد تک سالم شکل میں ہندوستان کے ان شمال مغربی علاقوں (موجودہ پاکستان) میں اب بھی موجود ہیں جن کو حال ہی میں انگریزی عملداری میں شامل کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی شخص ایشیا کی جامد استبدادیت کی اس سے زیادہ ٹھوس بنیاد کا تصور بھی نہیں کر سکتا'۔ [۲۰]

دیہی نظام کے جمود آفریں کردار سے متعلق مارکس کے خیالات میں آخر وقت تک کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ چنانچہ کتاب 'سرمایہ' میں وہ رقم طراز ہے کہ:

'وہ چھوٹی اور انتہائی قدیم ہندوستانی جمعیتیں جن میں سے بعض اب تک جی رہی ہیں، زمین پر مشترکہ قبضے اور زراعت اور دستکاری کی آمیزش پر اور ناقابلِ تغیر، تقسیم کار پر مبنی ہیں... ان میں سے ہر ایک جمعیت جس کے پاس سو ایکڑ تا ہزاروں ایکڑ رقبۂ زمین ہوتا ہے ایک گٹھا ہوا کُل ہوتی ہے جو اپنی ضرورت کی سب چیزیں خود پیدا کرتی ہے۔ پیداوار کا معتد بہ حصہ خود جمعیت کے براہِ راست استعمال کے لیے مخصوص ہوتا ہے اور اشیاء بازاری کی شکل اختیار نہیں کرتا... فقط فاضل پیداوار بازاری مال بنتی ہے اور اس کا بھی ایک حصہ اس وقت تک بازاری مال نہیں بنتا جب تک ریاست کے ہاتھوں میں نہ پہنچ جائے۔ پیداوار کا یہ حصہ پراچین زمانے سے ریاست کو جنس کی شکل میں بطور لگان پہنچتا رہا ہے۔ ان جمعیتوں کی شکل ہندوستان کے مختلف حصوں میں ایک دوسرے سے مختلف رہی ہے۔ سب سے سیدھی سادی جمعیتوں میں زمین مشترکہ طور پر جوتی/بوئی جاتی ہے اور پیداوار جمعیت کے ارکان میں بانٹ دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہر خاندان میں کتائی بُنائی ضمنی صنعتوں کے طور پر ہوتی رہتی ہے۔ عام کسانوں کے پہلو بہ پہلو جن کا بس ایک ہی دھندا ہوتا ہے ہم کو گاؤں میں ایک 'خاص باشندہ' بھی ملتا ہے جو بیک وقت جج بھی ہوتا ہے اور پولیس مین اور تحصیلدار بھی، پھر پٹواری جو زیرِ کاشت زمین اور اس سے متعلق سب چیزوں کا حساب رکھتا ہے۔ ایک اور عہدے دار (چوکیدار) جو مجرموں کا چالان کرتا ہے اور اجنبی مسافروں کو بہ حفاظت دوسرے گاؤں تک پہنچاتا ہے۔ ہمسایہ جمعیتوں سے گاؤں کی حدود کی حفاظت کرنے والا، نیر گنتی جو مشترکہ تالاب کے پانی کو تقسیم کرتا ہے، برہمن جو مذہبی رسوم ادا کرتا ہے، مدرّس جو بچوں کو ریت پر لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے، جوتشی جو فصلوں کی بوائی اور کٹائی اور دوسرے زرعی کاموں کے نیک اور نحس دن بتاتا ہے، لوہار اور بڑھئی جو تمام زرعی آلات و اوزار

تیار کرتے اور ان کی مرمت کرتے ہیں، کمہار جو گاؤں والوں کے لیے برتن بناتا ہے، حجام، دھوبی جو کپڑے دھوتا ہے، سونار، بھاٹ (میراثی) جو بعض جگہوں پر سونار کا کام کرتا ہے اور بعض جگہوں پر مدرّس کا۔ ان درجنوں افراد کی کفالت پورا گاؤں کرتا ہے۔ اگر آبادی تجاوز کر جائے تو کسی پَرتی زمین پر پُرانی وضع کی ایک نئی جمعیت قائم کر لی جاتی ہے۔ یہ پورا طریقۂ کار ایک باقاعدہ قسم کی تقسیمِ محنت کی نشاندہی کرتا ہے...... جمعیت کے اندر تقسیمِ محنت کے ضابطے قانونِ قدرت کے ناقابلِ مزاحمت اختیار کا کردار ادا کرتے ہیں۔ البتہ ہر کاریگر خواہ وہ لوہار ہو یا بڑھئی یا کوئی اور، دستکاری کے سب کام روایتی انداز میں لیکن پوری آزادی سے اور بلا کسی کی ماتحتی قبول کیے ہوئے سرانجام دیتا ہے۔ ان خود کفیل جمعیتوں میں جو برابر ایک ہی شکل میں اپنی تجدید کرتی رہتی ہیں اور اگر سوءِ اتفاق سے برباد ہو جائیں تو اسی مقام پر اور اسی نام سے دوبارہ اٹھ کھڑی ہوتی ہیں، پیداوار کی یہ سادہ اور سہل تنظیم ایشیائی معاشرے کے غیر متغیر ہونے کے راز کی کنجی ہے۔ اس غیر متغیر ہونے کا موازنہ ایشیائی ریاستوں کی پیہم شکست و ریخت اور ازسرِ نو قیام اور (شاہی) خاندانوں میں مسلسل تبدیلیوں سے کرو تو حیرت ہوتی ہے۔ سوسائٹی کے اقتصادی عناصر کا ڈھانچہ آسمانِ سیاست کے طوفاں خیز بادلوں سے بالکل متاثر نہیں ہوتا'۔ [۲]

مارکس کے یہ تاثرات کسی ایشیائی ملک کے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں پر مبنی نہ تھے بلکہ کرنل ولکز، جارج کیمبل، اسٹین فورڈ ریفلس اور الفنسٹن وغیرہ کی تصنیفات سے ماخوذ تھے۔ لیکن دورِ حاضر کے محققین کی تلاش و تفتیش سے مشرقی معاشروں کے وہ پہلو بھی اب منظرِ عام پر آ چکے ہیں جو مارکس کی نظروں سے اوجھل تھے۔ چنانچہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ مارکس کا یہ دعویٰ درست نہیں۔ مشرق کے معاشرے اور معیشت میں عہدِ قدیم سے ۱۹ویں صدی کے اوائل تک کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی اور یہ خیال بھی خلافِ حقیقت ہے کہ مغربی طاقتوں ہی کی بدولت یہاں

سرمایہ داری/صنعتی نظام کی داغ بیل پڑی۔ ان محققین کا دعویٰ ہے کہ ۱۸ویں صدی میں کم از کم ہندوستان میں صنعت و حرفت اور تجارتی سرمایہ داری نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ اگر انگریزوں نے اس رجحان کو زبردستی ختم نہ کر دیا ہوتا تو ہندوستان میں صنعتی انقلاب کے حق میں معروضی حالات بہت سازگار تھے۔ مثلاً ڈاکٹر اعجاز احمد لکھتے ہیں کہ جدید تلاش و تحقیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فرنگیوں کے نافذ کیے ہوئے نوآبادیاتی نظام سے قبل ایشیا:

'کم از کم اتنا پس ماندہ نہ تھا جتنا کہ مارکس اور اس کے ہم عصروں نے سمجھ رکھا تھا، ہندوستان دیہی جمعیتوں کا مجموعہ نہ تھا اور نہ اس کے شہر محض فوجی چھاؤنیاں تھے۔ نقل و حرکت اور ابلاغ کے ذرائع ۱۶ویں صدی میں، نوآبادیاتی نظام کی آوردہ بربادیوں سے قبل، ۱۹ویں صدی کے مقابلے میں یعنی نوآبادیاتی غلبے کے تین سو برس قبل، کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ فاضل اشیا فقط مقامی عمائدین کے استعمال کے لیے نہیں پیدا کی جاتی تھیں بلکہ تجارت کی پھیلی ہوئی سرگرمیوں کے لیے جمع کی جاتی تھیں، اس کی وجہ سے سماجی تشکیلات میں تجارتی سرمائے کی پوزیشن بہت قوی ہوگئی تھی اور پیداوار کے ذرائع اور طریقوں میں ٹیکنیکل انقلابوں کے لیے ترغیب میں اضافہ ہو رہا تھا'۔[۲۲]

یہ تاریخ کا وہی رومانوی تصور ہے جس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مارکس نے لکھا تھا کہ:

'میں ہندوستان کے کسی عہدِ زرّیں کا قائل نہیں'۔

ہم مانتے ہیں کہ ہندوستان انگریزوں کی آمد سے قبل دیہی جمعیتوں کا مجموعہ نہ تھا۔ ہم کو یہ بھی تسلیم ہے کہ ہمارے شہر فقط فوجی چھاؤنی نہ تھے بلکہ بہت سے شہروں کی وجۂ شہرت ان کی اعلیٰ درجے کی مصنوعات تھیں۔ ڈھاکہ، مرشد آباد، بنارس، لکھنؤ، اورنگ آباد، برہان پور، ملتان، ٹھٹھہ، نصر پور، کالی کٹ، بیدر، سورت، گلبرگہ، مسولی پٹم غرضیکہ بے شمار شہر تھے جو صنعت و تجارت کی سرگرمیوں میں یورپ کے شہروں سے پیچھے نہ تھے۔ اس کے باوصف ہندوستان سمیت مشرق کے کسی ملک کے سیاسی اور اقتصادی حالات کا رُخ صنعتی سرمایہ داری یعنی خودکار مشینوں کے ذریعے بازار کے لیے بڑے پیمانے پر صنعتی پیداوار کی جانب نہ تھا۔ نہ تجارت پیشہ طبقے کو جاگیری نظام کی

گرفت سے آزاد ہونے کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ کسانوں نے اپنے خودکفیل دیہی نظام کو توڑنے اور جاگیرداروں، زمینداروں اور اجارہ داروں کے بے پناہ ظلم و جور سے آزاد ہونے کی خاطر کوئی طبقاتی جدوجہد شروع کی۔

یورپ میں سرمایہ داری نظام کی داغ بیل چودہویں پندرہویں صدی میں اٹلی کے تجارتی شہروں میں پڑی جو بحرِروم کے ساحل پر واقع تھے اور جہاں خودمختار ری پبلکیں قائم تھیں۔ وینس، جنیوا، فلورنس وغیرہ میں عنانِ اقتدار تجارت پیشہ امراء کے ہاتھ میں تھی۔ مارسیلز، لیون، انٹ ورپ، لندن اور دوسرے بڑے تجارتی شہروں میں بھی تجارت پیشہ طبقے نے فیوڈل اقتدار سے باقاعدہ جنگ کرکے شہری حقوق کی سندیں (چارٹر) حاصل کی تھیں اور کوئی ان کے کاروباری معاملات میں مداخلت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ فرانس اور برطانیہ کے بادشاہوں کا مفاد بھی اسی ابھرتے ہوئے تجارت پیشہ طبقے سے وابستہ تھا۔ وہ خودمختار کلیسا (جو سب سے بڑا زمیندار تھا) اور سرکش و سرہنگ نوابوں کی طاقت کو گھٹانے کی خاطر تاجروں بیوپاریوں ہی کی حمایت حاصل کرتے اور ان کو مراعات سے نوازتے رہتے تھے۔

ہندوستان میں صورتِ حال بالکل برعکس تھی۔ یورپ میں نواب اپنی ریاست کے مالک ہوتے تھے۔ یہ حقِ ملکیت موروثی تھا جس کو بادشاہ منسوخ نہیں کرسکتا تھا۔ مگر ہندوستان کے مغلیہ دور میں بادشاہ زمین کا مالک ہوتا تھا اور جاگیردار منصب دار اس کے رحم و کرم پر تھے۔ ان کو اپنی جاگیروں پر مالکانہ اور موروثی حقوق حاصل نہیں تھے۔ وہ رعایا سے فقط واجبات وصول کرسکتے تھے اور دو تین سال بعد کسی دوسرے علاقے میں تبدیل کردیئے جاتے تھے۔ وہ کاشتکاروں سے جائز واجبات کے علاوہ بہت سے ناواجب محصولات اپنی فوجی طاقت کے بل پر وصول کرتے تھے۔ (منصب داری نظام کی خرابیوں پر ہم 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا اور 'نویدِ فکر' میں تفصیل سے بحث کرچکے ہیں۔)

یورپ میں سرمایہ داری نظام کے بانی بیوپاری اور مہاجن تھے۔ انہیں کی کوششوں کا نتیجہ صنعتی انقلاب کی شکل میں نمودار ہوا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان میں تجارت پیشہ طبقے کی نوعیت کیا تھی اور اس نے معیشت میں کیا کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر اعجاز احمد کا خیال ہے کہ 'سماجی تشکیلات میں تجارتی سرمائے کی پوزیشن بہت مضبوط ہوگئی تھی' لیکن حقیقت یہ ہے کہ تجارت پیشہ طبقے کی پوزیشن کبھی

اتنی مضبوط نہ ہوئی کہ وہ بادشاہ یا منصب داروں اور نوابوں کی فوجی طاقت سے ٹکر لے سکتا یا ان پر دباؤ ڈال کر اقتصادی مراعات حاصل کر سکتا۔

تجارتی سرمائے کی حیثیت ہمارے فیوڈل نظام میں دلال یا بچولیے سے زیادہ نہ تھی۔ بیوپاری طبقہ شہر اور دیہات کے دستکاروں کی مصنوعات کو بیشتر حاکم طبقے کے ہاتھ فروخت کر کے نفع کماتا تھا۔ لہٰذا اس کا مفاد فیوڈل نظام کو برقرار رکھنے میں تھا نہ کہ اس کو توڑنے میں۔ یورپ کے برعکس دستکاروں کے آلاتِ پیداوار پر اس کا کوئی اختیار نہ تھا۔ وہ دستکاروں کی فاضل قوتِ محنت اور پیداوار کا مالک نہ تھا یعنی پیداواری عمل کے دوران استحصال نہیں کر سکتا تھا بلکہ مال کے گردش میں آنے کے بعد طلب اور رسد کے قانون کے مطابق مال بیچ کر نفع کماتا تھا۔

بیوپاری اور ساہوکار سودی کاروبار کے ذریعے بھی اپنے سرمائے میں اضافہ کرتے تھے مگر ان کو منصب داروں کی فوجی طاقت کی پشت پناہی حاصل نہ تھی بلکہ منصب دار مہاجنوں کے مقابلے میں مقروض دستکاروں اور کاشتکاروں کی حمایت کرتے تھے۔

ہندوستان میں سودی کاروبار کا رواج ضرور تھا اور ساہوکار سود کے ذریعے اپنے سرمائے میں اضافہ کرتے تھے مگر فیوڈل معاشرے میں سودخوروں کو بڑی حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کو منصب داروں کی فوجی طاقت کی پشت پناہی بھی نصیب نہ تھی نہ منصب داروں کو ان سے کسی قسم کی ہمدردی تھی بلکہ وہ عموماً مہاجنوں کے مقابلے میں مقروض دستکاروں اور کاشتکاروں ہی کی حمایت کرتے تھے۔ وہ رعایا کی قوتِ ادائیگی سے فائدہ اٹھانے میں اپنے سوا کسی اور کو شرکت کی اجازت نہ دیتے تھے۔

مہاجن اپنی پونجی کو بہت چھپا کر رکھتے تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہتے، موٹا جھوٹا پہنتے تاکہ کسی کو ان کی پس انداز دولت کا اندازہ نہ ہونے پائے۔ ان کو ہر وقت اپنی پونجی کے ضبط ہونے کا خوف لگا رہتا تھا کیونکہ مغربی سیاحوں کے سفرناموں کے مطابق نوابوں کے جاسوس ان کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ نوابوں کو اپنی عیاشیوں کے لیے ہر وقت روپیوں کی ضرورت رہتی تھی چنانچہ مہاجنوں کو پکڑ بلوایا جاتا، ان کو ایذا دی جاتی اور ان سے زبردستی مطلوبہ رقم وصول کی جاتی تھی۔

ویر جی بوہرہ سترہویں صدی میں سورت کا بہت بڑا تاجر تھا۔ وہ سونے، چاندی، مسالہ جات، افیون اور کپاس کا بیوپار کرتا تھا اور ساحل ملابار کی ساری تجارت اس کے کنٹرول میں تھی۔ اس کی

تجارتی کوٹھیاں احمد آباد، آگرہ، برہان پور اور گولکنڈے میں بھی تھیں۔ مگر ۱۶۳۸ء میں سورت کے صوبیدار مسیح الزماں نے اس کو قید کر دیا اور کثیر رقم کا طالب ہوا۔ لیکن صوبے کا دیوان اس کا دوست تھا۔ اس نے شاہ جہاں کو تمام حالات سے مطلع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسیح الزماں شاہی حکم سے برطرف ہوا اور پیرجی بوہرہ کو آزادی ملی۔ [۲۳] شیواجی مرہٹہ نے ۱۶۶۴ء میں سورت پر دھاوا کیا تو پیرجی بوہرہ کی جمع پونجی لٹ گئی اور اس کا کاروبار تباہ ہو گیا۔

یہ درست ہے کہ بعض اوقات نواب اور منصب دار اپنی فوجی طاقت کے بل پر کاروبار میں بھی شریک ہوتے تھے لیکن تجارت ان کا ضمنی مشغلہ ہوتا تھا۔ معاشرے میں قدر و منزلت اور اقتدار کا تعین چونکہ زمین پر قبضے کی بنیاد پر ہوتا تھا لہٰذا فیوڈلزم کی حمایت ان کے لیے ضروری تھی۔ مثلاً گولکنڈہ کے وزیر میر جملہ کا کاروبار دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے جہاز تجارتی مال لے کر ایران، بصرہ اور پیگو تک جاتے تھے مگر گولکنڈہ جب فتح ہوا اور اورنگ زیب نے میر جملہ کو اپنا وزیر مقرر کیا تو اس کو کاروبار ختم کرنا پڑا۔ نواب علی وردی خاں صوبیدار احمد آباد نیل کا اجارہ دار تھا (۱۶۴۷ء)۔ اسی طرح سورت کے صوبیدار کو جستے اور شورے کی اجارہ داری حاصل تھی۔ [۲۴]

یورپ اور ہندوستان کے تجارتی شہروں کی نوعیت میں بھی بڑا فرق تھا۔ یورپ کے تجارتی اور صنعتی شہر وینس، مِلان، جنیوا اور فلورنس کی مانند یا تو آزاد اور خودمختار ری پبلک تھے جن پر فیوڈل قوتیں اثرانداز نہیں ہو سکتی تھیں یا لندن، مارسلز، انٹ ورپ، لائبزیگ کی مانند تھے جنہوں نے فیوڈل طاقتوں سے باقاعدہ لڑ کر شہری حقوق اور تجارتی چارٹر حاصل کیے تھے۔ ان کو نوابوں کے مقابلے میں شاہانِ وقت کی حمایت بھی حاصل تھی چنانچہ رفتہ رفتہ ان کی اقتصادی اور سیاسی پوزیشن مستحکم سے مستحکم تر ہوتی گئی یہاں تک کہ ۱۸ویں صدی میں وہ حکومت پر قابض ہو گئے۔

مگر ہندوستان میں زمانہ پیچھے کی طرف دوڑا۔ تیرہویں چودہویں صدی میں ہندوستان کے تجارتی اور صنعتی شہر جو زیادہ تر جنوبی ہندیا سمندر کے کنارے واقع تھے بڑی حد تک خودمختار تھے۔

> 'ان کی اپنی اسمبلیاں تھیں جو دولت مند اور بااثر ذاتوں کے افراد پر مشتمل ہوتی تھیں۔ یہ لوگ کاروبار کے اعتبار سے بیوپاری یا دستکار تھے۔ یہ اسمبلیاں فقط امن عامہ کی نگرانی اور مقدموں کا فیصلہ ہی نہیں کرتی تھیں بلکہ بیوپاریوں اور دستکاروں سے واجبات بھی وصول کرتی تھیں اور

محصولات کا تعین بھی کرتی تھیں۔ وہ بڑی حد تک خودمختار ہوتی تھیں۔ اسی کے ساتھ ان شہروں میں تاجروں کی گلڈیں بھی تھیں جن کا دائرۂ اثر پورے تجارتی خطے پر پھیلا ہوا تھا لیکن رفتہ رفتہ جب فیوڈل ریاست کی طاقت بڑھی تو شہروں کی خودمختاری سلب کر لی گئی۔ واجبات کا تعین اور ان کی وصولی سرکاری حکام کرنے لگے۔ ضلعوں کے چھوٹے دکانداروں اور دستکاروں سے وصول شدہ رقمیں فیوڈل امرا کو بخش دی گئیں۔ شہری اسمبلیاں ختم ہو گئیں اور تاجروں کی گلڈوں کا اثر ورسوخ باقی نہ رہا۔

'تیرہویں صدی کے اواخر اور ۱۴ ویں صدی کے آغاز سے بادشاہ پورے پورے شہر فیوڈل امرا کے حوالے کرنے لگے...... یہ امرا گاؤں کی طرح شہروں میں بھی من مانی کرتے تھے۔ اس وقت سے بیوپاری اپنی دولت کے باوصف فیوڈل امرا کے شاہانہ مزاج کے تابع ہو گئے۔ اگر وہ ان مطلق العنان حاکموں کو مطلوبہ رقم پیش نہ کرتے تو ان کو طرح طرح سے تنگ کیا جاتا بلکہ قید خانے میں ڈال دیا جاتا تھا'۔ [۲۵]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سلاطینِ دہلی کے دور میں صنعت وحرفت میں نمایاں ترقی ہوئی۔ خود بادشاہوں نے شاہی خاندان کی ضرورتوں کے لیے بڑے بڑے صنعتی ادارے قائم کر رکھے تھے جن کو 'کارخانہ' کہتے تھے۔ سلطان علاؤالدین کے کارخانوں میں سترہ ہزار کاریگر ملازم تھے۔ ان کو تنخواہ شاہی خزانے سے ملتی تھی۔ اسی طرح محمد تغلق کے کارخانوں میں چار ہزار پارچہ باف کام کرتے تھے۔ مغلوں کے دور میں ان کارخانوں میں اور اضافہ ہوا۔ مگر یہ شاہی کارخانے بازار میں مال بیچ کر نفع کمانے کی خاطر نہیں بنائے گئے تھے بلکہ ان میں شاہی خاندان اور لواحقین کے ذاتی استعمال کی چیزیں تیار ہوتی تھیں۔ لہٰذا ان کارخانوں کی کارگزاری میں وہ عوامل اور محرکات ہی سرے سے مفقود تھے جو دوسرے سرمایہ داروں سے مقابلے میں سبقت حاصل کرنے اور نفع کی شرح بڑھانے کی خاطر سرمایہ دار طبقے کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ مشینوں کی قوت پیداوار اور کارکردگی کو بڑھانے اور دستکاروں کی محنت کو کم سے کم استعمال کرنے کی غرض سے آلاتِ پیداوار کو بہتر بنائے اور نئی سے نئی مشینیں ایجاد کرنے کی کوشش کرتے۔ سرکاری کارخانوں میں دستکاروں کا استحصال

ضرور ہوتا تھا لیکن ان کی قوت محنت سے فقط قدرِ استعمال پیدا ہوتی تھی نہ کہ قدرِ تبادلہ۔ ان کے تیار کیے ہوئے مال سے سرمائے کا ارتکاز بھی نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ سرمایہ جو دیہات کے استحصال سے جمع ہوتا تھا شہروں میں صرف ہو جاتا تھا۔

سرمایہ داری نظام کے فروغ میں بحری تجارت نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ بحرِ اوقیانوس، بحرِ ہند اور بحرالکاہل جیسے سمندروں کو آسانی سے عبور کرنے کے لیے آلاتِ جہاز رانی میں اصلاح و ایجاد نہایت ضروری تھی چنانچہ برطانیہ کے صنعت کاروں نے سب سے پہلے اسی جانب توجہ دی۔ ہندوستان میں جو تجارتی اور صنعتی شہر سمندر سے دور تھے وہ بحری تجارت کے تقاضوں کو محسوس نہیں کر سکتے تھے البتہ جنوبی ہند بالخصوص گجرات، ساحلِ ملابار، سندھ اور خلیج بنگال کے معروضی حالات بحری تجارت کے حق میں بہت سازگار تھے اور چودھویں صدی میں ان علاقوں پر فیوڈل طاقتوں کا غلبہ نہ ہوا ہوتا اور وہاں کے تجارتی شہروں کی خودمختاری برقرار رہتی تو عین ممکن ہے کہ جلد یا بدیر کم از کم جنوبی ہند اور سندھ میں تجارتی سرمایہ داری صنعتی سرمایہ داری کی شکل اختیار کر لیتی۔

بحری تجارت اور جہاز رانی کی صنعت کے فروغ نہ پانے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ۱۶ ویں صدی کی ابتدا ہی سے بحرِ عرب پر پرتگالی جہازوں کا غلبہ ہو گیا۔ یہ جہاز توپوں تفنگوں سے مسلح ہوتے تھے جب کہ مغلوں نے بحری طاقت کی طرف کبھی توجہ نہ دی تھی۔ چنانچہ اکبر کے زمانے میں شاہی خاندان کے افراد بھی پرتگالی جہازوں ہی کے ذریعے حج کرنے پر مجبور ہوتے تھے اور پرتگالی جہاز راں حجاج سے حضرت مسیح اور حضرت مریم کے مجسموں کو سجدہ کرواتے تھے۔ پرتگالی جب چاہتے ہماری بندرگاہوں کی ناکہ بندی کر دیتے اور گولہ باری کر دیتے۔ پرتگالیوں کے اس بحری اقتدار کو ختم کرنے کی خاطر بیجاپور کے سلطان نے ۱۵۷۰ء میں احمد نگر اور کالی کٹ کے ساتھ مل کر تین لاکھ کی فوج سے گوا اور چول کا محاصرہ کیا لیکن پرتگالیوں کی بحری طاقت کے آگے پیش نہ گئی۔ ۱۵۳۵ء میں پرتگالیوں نے ڈیو کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا اور گجرات کا فرماں روا بہادر شاہ کچھ نہ کر سکا۔ پرتگالیوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر گجرات پر مغلوں نے حملہ کیا تو وہ اس کی مدد کریں گے لیکن جب مغلوں نے حملہ کیا تو پرتگالی وعدے سے پھر گئے۔ بہادر شاہ ان سے گفت و شنید کرنے پرتگالی وائسرائے کے جہاز پر گیا تو پرتگالیوں نے اس کو قتل کر دیا (۱۵۳۷ء)۔

سترہویں صدی میں ملک کے حالات اور ابتر ہو گئے۔ سورت، کالی کٹ اور دوسری

بندرگاہوں کے قرب و جوار میں مغلیہ حکام کی لاقانونیت کے سبب بدامنی اور بے یقینی اتنی بڑھ گئی کہ ہندوستانی بیوپاری فرنگیوں ہی سے کاروباری ناتا جوڑنے پر مجبور ہوئے اور ان کی سرپرستی ہی میں عافیت جانی۔ اس طرح ملک میں ایک سمجھوتے باز طبقہ پیدا ہوا جو برابر ترقی کرتا گیا۔

سترہویں صدی کے اواخر اور ۱۸ ویں صدی کے آغاز میں دہلی کا فیوڈل مرکز کمزور ہوا تو سندھ، بنگال بہار، اودھ اور دکن کے صوبیداروں نے اپنی اپنی خودمختار ریاستیں قائم کر لیں۔ جنوب مغربی ہند میں مرہٹہ اور پنجاب اور سرحد میں سکھ بھی آزاد ریاست بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ مرکز سے کٹ کر جو خودمختار ریاستیں بنیں وہ بھی مروجہ فیوڈل نظام کے دائرے ہی میں رہیں۔ یہ ساری شکست و ریخت ہندوستان میں فرنگیوں کا عمل دخل ہونے سے بہت پہلے شروع ہو گئی تھی مگر اس پورے دور میں جب کسانوں، جاٹوں اور راجپوتوں کی بغاوتیں ہو رہی تھیں اور جگہ جگہ خودمختار ریاستیں قائم ہو رہی تھیں ہم کو ہندوستان کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جب پورے ملک میں نہ سہی سندھ یا گجرات یا ملابار ہی کے تاجروں اور دستکاروں نے اپنے حقوق کی خاطر فیوڈل طاقتوں سے یورپ کے سرمایہ دار طبقے کی مانند مسلح یا پُرامن جدوجہد کی ہو۔ ہندوستانی معاشرے کے فیوڈلزم سے سرمایہ داری نظام میں تبدیل نہ ہونے کا بنیادی سبب یہی ہے کہ یہاں کے تجارت پیشہ طبقے نے فیوڈل ازم سے چھٹکارا پانے اور سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنے کی نہ کبھی ضرورت محسوس کی اور نہ کبھی کوشش کی۔

یہ مفروضہ بھی قابلِ قبول نہیں کہ اگر فرنگی طاقتوں کا غلبہ نہ ہوتا تو دیر سویر یہاں سرمایہ داری نظام ازخود قائم ہو جاتا۔ پُرتگالی امیر البحر نے ۱۵۱۰ء میں گوا پر قبضہ کیا جو سلطان بیجاپور کا جزیرہ تھا۔ بمبئی، ۱۶۶۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے حصے میں آیا۔ مدراس کو انگریزوں نے ۱۶۳۸ء میں آباد کیا۔ مگر سندھ کو ۱۸۴۲ء میں فتح کیا۔ گویا سندھ فرنگیوں کے وارد ہونے کے دو سو برس تک آزاد اور خودمختار رہا۔ مگر مغربی طاقتوں نے سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں سندھ، پنجاب، سرحد اور بلوچستان میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ ان علاقوں میں اگر فیوڈل ازم کو ختم کرنے کی صلاحیت ہوتی تو اس کے لیے دو صدیاں ناکافی نہ تھیں۔ سندھ کو انگریزوں نے ۱۸۴۲ء میں فتح کیا تھا۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں جب مشرق میں جگہ جگہ آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں تو سامراجی ملکوں کے بعض سوشلسٹوں نے بھی ان تحریکوں کی مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ مغربی طاقتیں ایشیا

اور افریقہ کے باشندوں کو جدید تہذیب کی برکتوں سے روشناس کر رہی ہیں اور جب تک تہذیب آموزی کا یہ تاریخی فریضہ پورا نہ ہو جائے مقبوضات کے حقِ خود ارادیت کا مطالبہ کرنا درست نہیں۔ اپنے اس موقف کی تائید میں وہ مارکس اور اینگلز کی تحریروں کے حوالے بھی دیتے تھے۔ لینن نے ان نام نہاد سوشلسٹوں پر کڑی نکتہ چینی کی اور کہا کہ یہ تہمت کہ سوشلزم کے بانی نوآبادیاتی نظام کے حامی تھے سراسر بے بنیاد ہے۔ کیونکہ مارکس اور اینگلز نے محکوم ملکوں کی آزادی کی جدو جہد کو ہمیشہ سراہا ہے۔

مشرق میں تو اب تک کسی دیانت دار سیاسی مفکر نے مارکس اور اینگلز پر سامراج نوازی کا الزام نہیں لگایا مگر مغرب میں بعض افراد اب تک وہی پرانا راگ الاپ رہے ہیں اور سامراجی طاقتوں کے 'ترقی پسندانہ' کردار کے معترف ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مارکس اور اینگلز نے سرمایہ داری نظام کو فیوڈل ازم پر ہمیشہ فوقیت دی اور سرمایہ داری نظام نے معاشرے کی ترقی میں جو انقلابی کردار ادا کیا ہے اس کو تسلیم کرنے میں کبھی بخل نہیں کیا۔ مگر ان کی سوچ تاریخی ہے۔ ان کا مقصد معاشرے کے عہد بہ عہد ارتقا کا نقشہ کھینچنا تھا اور سابقہ معاشرتی نظاموں پر سرمایہ داری نظام کی برتری کی وضاحت کرنا تھا۔ مثلاً کمیونسٹ مینی فسٹو میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> 'بورژوا طبقے نے تاریخی اعتبار سے نہایت انقلابی خدمت انجام دی ہے...... وہ پہلا طبقہ ہے جس نے دکھادیا کہ انسان کی کارگزاری کیا کچھ کر سکتی ہے۔ اس نے وہ عجائبات پیش کیے جن کے آگے مصر کے اہرام، روم کی نہریں اور گوتھک نمونے کے شاندار گرجے ہیچ ہیں۔ اس نے وہ وہ مہمیں سر کی ہیں جن کے سامنے تمام اگلے وقتوں کی قوموں کی مہمیں اور صلیبی جنگیں مات ہیں...... بورژوا طبقہ تمام آلاتِ پیداوار کو تیزی سے ترقی دیتا ہے اور آمد و رفت کے وسیلوں کو بے حد آسان بنا دیتا ہے اور ان کے بل پر وہ تمام قوموں کو حتیٰ کہ انتہائی وحشی قوموں کو بھی تہذیب کے دائرے میں کھینچ لاتا ہے۔ اس کے تجارتی مال کی ارزانی گولے بارود کا کام کرتی ہے جن سے وہ ہر دیوارِ چین کو مار مار کر گرادیتا ہے اور ضدی سے ضدی وحشیوں کو جن کے دل سے غیروں کی نفرت کا جذبہ مٹائے نہیں مٹتا،

ہار ماننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ تمام قوموں کو مجبور کرتا ہے کہ بورژوا طریقہ پیداوار کو اپنائیں ورنہ فنا ہو جائیں گے۔ وہ انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی اس کی منہ بولی تہذیب کو اپنے یہاں رائج کریں یعنی وہ خود بھی بورژوا بن جائیں...... بورژوا طبقے نے آبادی کے بڑے حصے کو دیہاتی زندگی کے گنوار پن سے چھٹکارا دلایا ہے اور جس طرح اس نے دیہات کو شہروں کا دست نگر بنایا، اسی طرح غیر مہذب اور نیم مہذب ملکوں کو مہذب ملکوں کا، زراعت پیشہ قوموں کو بورژوا قوموں کا اور مشرق کو مغرب کا تابع فرمان بنایا ہے۔

مقبوضاتی نظام کے حامی ان اقتباسات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مارکس اور اینگلز مقبوضاتی نظام کے حق میں تھے مگر یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ایٹم کی پوشیدہ طاقت کی دریافت پر سائنس دانوں کو مبارک باد دے اور جوہری توانائی کے فوائد بیان کرے تو اس پر یہ الزام لگایا جائے کہ وہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم پھینکنے والوں کی تائید کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مارکس اور اینگلز کی تحریریں مقبوضاتی نظام کے خلاف ایک طویل فردِ جرم ہیں۔ انہوں نے سرمایہ داری نظام کے عروج و زوال کی جو داستان رقم کی اس کا سب سے خونی باب وہی ہے جس میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں مغرب کی سرمایہ دار قوتوں کی حشر انگیزیوں کے تذکرے ہیں۔ سرمائے کے ارتکاز کی خاطر سونے چاندی کی کانوں کی بے دریغ لوٹ، منڈیوں اور بازاروں کی اجارہ داری کی خاطر دور دراز ملکوں کی تسخیر، ان کی صنعت و حرفت اور تجارت کی بربادی اور فوجی طاقت کے ذریعے ان پر ظلم و ستم غرضیکہ مقبوضاتی نظام کے استحصالی کردار کا کوئی پہلو نہ تھا جس کو مارکس اور اینگلز نے بے نقاب نہ کیا ہو۔

انہوں نے مقبوضاتی نظام کی مذمت ہی پر اکتفا نہ کی بلکہ چین ہو یا جاوا، افغانستان ہو، ہندوستان ہو یا آئرلینڈ جس محکوم ملک میں بھی آزادی کی جدوجہد کے آثار دکھائی دیئے یا بغاوت ہوئی، مارکس اور اینگلز نے اس کا خیر مقدم کیا۔

مارکس اور اینگلز فیوڈل ازم کے مقابلے میں سرمایہ داری نظام کو یقیناً ترجیح دیتے ہیں لیکن نوآبادیاتی نظام کی اور مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کی فقط مذمت ہی نہیں کرتے بلکہ مقبوضات

میں جہاں کہیں بغاوت ہوتی ہے یا آزادی کی جدوجہد کے آثار دکھائی دیتے ہیں تو وہ انقلابی سرگرمیوں کی بھرپور حمایت کرتے ہیں۔ چین کے مزدور ہوں یا ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور افغانستان میں انگریزوں کی شکست ــــ وہ 'تہذیب آموزوں' کا مذاق اُڑاتے ہیں، اُن کی جدوجہد کو قومی آزادی کی جنگ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اینگلز کا لہجہ دیکھیے:

> چینیوں میں اب ایک نئی روح نظر آتی ہے...... لوگوں کی بڑی تعداد باہر والوں کے خلاف جدوجہد میں عملی حصہ لے رہی ہے بلکہ دیوانہ وار حصہ لے رہی ہے۔ وہ ہانگ کانگ میں یورپیوں کی روٹیوں میں زہر ملا دیتے ہیں۔ وہ تجارتی جہازوں پر پوشیدہ طور پر مسلح ہوکر جاتے ہیں اور جب جہاز چلنے لگتا ہے تو یورپین ملازموں اور مسافروں کو قتل کر دیتے ہیں اور جہاز پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ یہ قُلی پردیس میں رہ کر بغاوت کر دیتے ہیں تہذیب نواز خبیث جو نہتے شہر پر گولے برساتے ہیں اور قتل اور زنا بالجبر کے مرتکب ہوتے ہیں ان حرکتوں کو بزدلانہ، ظالمانہ اور بہیمانہ کہیں مگر چینیوں کو اس سے غرض نہیں بشرطیکہ وہ کامیاب ہو جائیں...... بہتر یہی ہے کہ ہم اس صورتِ حال کو چین کی قوم کی اپنی آزادی بچانے کی عوامی جنگ تسلیم کر لیں'۔

حوالہ جات

۱۔ کارل مارکس، *A Contribution to the Critique of Political Economy*، بحوالہ سابقہ، ص ص ۲۳۔۲۲

۲۔ مارکس اور اینگلز، *Selected Correspondence* (ماسکو، تاریخ ندارد)، ص ۹۹

۳۔ ایضاً۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۵۔ آر۔اے۔ایل۔ایچ۔گوتاورتا، Indian Historical Review، ص ۳۷۴

۶۔ کارل مارکس، Capital، جلد اوّل، (ماسکو، ۱۹۵۴ء)، ص ص ۵۸۔۳۵۷

۷۔ نظام الملک طوسی، 'سیاست نامہ' (لاہور، ۱۹۶۱ء)، ص ۳۵

۸۔ ڈی۔ڈی۔کوسامبی، Introduction to the Study of Indian History (بمبئی، ۱۹۵۶ء)، ص ۲۱۵

۹۔ ایضاً، ص ۲۱۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۱۹

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۰۰

۱۲۔ رومیلا تھاپڑ، A History of India، جلد اوّل (لندن، ۱۹۸۱ء)، ص ص ۷۷۔۷۶

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ عرفان حبیب، The Agrarian System of Mughal India (بمبئی، ۱۹۶۳ء)، ص ۱۵۹

۱۵۔ آر۔سی۔مجمدار، Advance History of India (لندن، ۱۹۶۱ء)، ص ۸۰۷

۱۶۔ الفنسٹن مانسٹوارٹ، History of India، جلد اوّل (لندن، ۱۸۴۱ء)، ص ص ۳۹۔۱۲۶

۱۷۔ کارل مارکس، On Colonialism (ماسکو)، ص ص ۳۶۔۳۴

۱۸۔ ایضاً، ص ۳۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۸

۲۰۔ مارکس اور اینگلز، Selected Correspondence، ص ۱۰۳

۲۱۔ کارل مارکس، Capital، جلد اوّل (لندن، ۱۹۷۹ء)، ص ص ۷۹۔۴۷۷

۲۲۔ رونالڈ۔ایچ۔شلکوٹ اور ڈیل ایل جانسن (ایڈیٹرز) Theories of Development (کیلیفورنیا، ۱۹۸۳ء)، ص ۵۰

۲۳۔ ڈبلیو۔ایچ۔مدرلینڈ، From Akbar to Aurangzeb (لندن، ۱۹۲۳ء)، ص ۱۵۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۲۵۔ کے۔اینٹونووا اور دیگر (ایڈیٹرز)، History of India، جلد اوّل (ماسکو، ۱۹۷۹ء)، ص ص ۹۵۔۱۹۴

کارل مارکس اور دنیائے اِسلام

مارکس اور اینگلز نے جس وقت اخبار 'نیویارک ڈیلی ٹری بیون' میں لکھنا شروع کیا (۱۸۵۱ء) اس وقت مشرقی دنیا بالخصوص دنیائے اسلام شدید سیاسی بحران میں مبتلا تھی۔ انڈونیشیا پر ولندیزی قابض تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے آہستہ آہستہ پورے ہندوستان پر اپنا اقتدار مستحکم کرلیا تھا (سندھ کی تسخیر ۱۸۴۲ء، پنجاب و سرحد ۱۸۴۶ء)۔ ملایا برطانوی سلطنت کا جُز بن چکا تھا۔ چین کو جنگِ افیون (۱۸۴۲ء) میں برطانیہ کے ہاتھوں شکست ہوچکی تھی اور برطانیہ نے چین کی بندرگاہوں ___ شنگھائی، کینٹن، فوچاؤ اور اَموائے ___ کی درآمد برآمد پر قبضہ کرلیا تھا اور ہانگ کانگ کے جزیرے کو پٹے پر حاصل کرلیا تھا۔

اِدھر بحرِ عرب کے ساحل پر عمّان، بحرین، عدن اور حضر موت میں انگریزوں نے فوجی چھاؤنیاں قائم کردی تھیں اور مقامی شیوخ کو اپنا وظیفہ خوار غلام بنالیا تھا۔ مصر بھی برطانیہ کے زیرِاثر آتا جارہا تھا۔ ۱۸۳۸ء کے اینگلوترکی معاہدے کی رو سے انگریز اپنی مصنوعات بلامحصول ادا کیے مصر میں درآمد کرسکتے تھے چنانچہ مصر کی ایک چوتھائی درآمد اور ایک تہائی برآمد انگریزوں کے تصرف میں تھی۔ ۱۸۴۹ء میں محمد علی پاشا کے انتقال کے بعد اس کے جانشین عباس پاشا نے محمد علی پاشا کے سارے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ اس نے جو فیکٹریاں لگوائی تھیں انہیں انگریزوں کے دباؤ میں آکر بند کروادیا اور دریائے نیل پر جو بند زیرِتعمیر تھا اس کو بھی تڑوادیا[1]۔ ۱۸۵۱ء میں اس نے اسکندریہ سے سوئز تک ریلوے لائن بچھانے کا ٹھیکہ بھی انگریزوں کو دے دیا۔ اس ریلوے کی تعمیر سے پہلے ہندوستان جانے والے انگریز اسکندریہ تک جہاز میں آتے، وہاں سے سوئز تک اونٹوں پر سفر کرتے اور پھر وہاں سے دوبارہ جہاز میں سوار ہوتے تھے۔ ریلوے لائن کی تعمیر کے

بعد ہفتوں کا یہ سفر گھنٹوں میں طے ہونے لگا۔ ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان میں بغاوت شروع ہوئی تو لندن سے گورا پلٹنیں اسی راستے ہندوستان بھیجی گئیں۔

الجزائر کو فرانس نے اپنے قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔ مراکش میں اسپین کا عمل دخل تھا۔ وسطی ایشیا میں بخارا، قوقند اور خیوا کی امارتیں معاشرتی انحطاط اور اخلاقی پستی کا عبرت ناک منظر پیش کر رہی تھیں اور عنقریب زار روس کی توسیعی پالیسی کا شکار ہونے والی تھیں۔ افغانستان اس حد تک برطانیہ کے تابع تھا کہ وہاں امیر کا تقرر بھی برطانیہ کی مرضی سے ہوتا تھا۔ ایران کی سیاست اور تجارت پر بھی برطانیہ ۱۹ویں صدی کی ابتدا ہی سے حاوی تھا۔ لارڈ ویلزلی، وائسرائے ہند (۱۷۹۸ء۔۱۸۰۵ء) کی ایما پر سر جان میلکم کو بطور سفیر تہران بھیجا گیا تھا تاکہ وہ نپولین کے نمائندوں کی سرگرمیوں کا سدِباب کرے۔ سر جان میلکم ایران کے ساتھ تجارت اور 'دوستی' کا معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوا اور نپولین کے نمائندوں نے شکست کھائی۔ رفتہ رفتہ انگریزوں کا اثر و رسوخ اتنا بڑھا کہ ۱۸۳۴ء میں انہوں نے اپنے امیدوار فتح علی شاہ قاچار کو تخت پر بٹھا دیا اور قرضے دے دے کر ایران کی آزادی رہن رکھ لی۔

بس ایک سلطنتِ عثمانیہ باقی بچی تھی جس کو آزاد اور خودمختار کہا جا سکتا تھا۔ یورپ میں رومانیہ، بلغاریہ، مقدونیہ، سربیا اور البانیہ اور ایشیا میں عراق، شام، لبنان، فلسطین اور حجاز اور شمالی افریقہ میں مصر، لیبیا اور تونس عثمانیوں کے زیرِ نگیں تھے مگر ان پر اب اتنی وسیع و عریض سلطنت کا لنگر سنبھالنے کی صلاحیت نہ تھی اور حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے، چنانچہ اہلِ مغرب ترکی کو 'یورپ کا مرد بیمار' کہنے لگے تھے۔ سب سے بڑا روگ سلطنت کا نہایت فرسودہ فیوڈل نظام تھا جس کے چاروں ستون ــــ سلطان، اُمرا، مشائخ اور فوج ــــ گھن کھائی لکڑی کی مانند اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے۔ محکوم قوموں، بالخصوص یورپی علاقوں کی محکوم قوموں کی آئے دن کی بغاوتیں اس پر مستزاد تھیں۔

سلطان محمد دوئم (۱۴۵۱ء۔۱۴۸۱ء) فاتح قسطنطنیہ کے عہد میں سلطنت کی غیر مسلم رعایا کی تنظیم 'ملتوں کی خودمختاری' کے اصول پر کی گئی تھی چنانچہ مشرقی کلیسا، ارمنی کلیسا، رومی کلیسا کے پیرو اور یہودی سب اپنے اپنے مذہبی پیشواؤں کے تابع ہوتے تھے۔ ان پیشواؤں کو اپنے ہم مذہبوں پر پورا پورا اختیار ہوتا تھا حتیٰ کہ ان کے مقدموں کا فیصلہ بھی یہی پیشوا اور ان کے نائب کرتے تھے۔ یہ

مذہبی پیشوا باب عالی اور غیر مسلم رعایا کے درمیان رابطے کے فرائض انجام دیتے تھے اور اپنے ہم مذہبوں کی سرگرمیوں کے لیے سلطان کے روبرو جواب دہ ہوتے تھے۔ جب تک مرکز مضبوط رہا اس اصول پر خوش اسلوبی سے عمل ہوتا رہا لیکن ۱۹ویں صدی میں ان مذہبی اقلیتوں میں جو درحقیقت قومی اقلیتیں تھیں جب آزادی کا شعور بڑھا تو سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں۔ یہ قومیں چونکہ روس کی مانند نسلاً سلاف تھیں لہٰذا روس ان کی پشت پناہی کو اپنا حق سمجھتا تھا اور اس بہانے ترکی سے زبردستی مراعات حاصل کرتا رہتا تھا۔ علاوہ ازیں ترکوں کو کاروبار سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ فوج میں بھرتی ہوتے یا سرکاری ملازمت کی کوشش کرتے تھے (مغلیہ دور میں مسلمانوں کی ذہنیت بھی یہی تھی)۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملکی تجارت دکانداری اور روپیہ کی لین دین حسبِ سابق عیسائیوں اور یہودیوں ہی کی اجارہ داری رہی اور جب سلطنت کمزور ہوئی تو برطانیہ، فرانس اور آسٹریا بھی ان کی حمایت کی آڑ میں ترکی کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے لگے۔

عجیب اتفاق ہے کہ کارل مارکس نے 'نیویارک ڈیلی ٹری بیون' میں اپنے قلم سے پہلا مضمون ترکی کی سیاست پر لکھا۔ اس وقت جنگِ کریمیا نہیں چھڑی تھی البتہ گناہ کے لیے عذرِ گناہ کی تلاش شروع ہوگئی تھی۔ چنانچہ فروری ۱۸۵۳ء میں زار روس نے ترکی سے مطالبہ کیا کہ ترکی نہ صرف اپنی کُل عیسائی رعایا کے تحفظ کا حق زار روس کے حوالے کردے بلکہ مشرقی کلیسا کے بطریق کو بھی زار روس ہی نامزد کیا کرے۔ اس بے جا مطالبے کا سیاسی پس منظر بیان کرتے ہوئے مارکس نے ۲۳ مارچ ۱۸۵۳ء کے خبر نامے میں لکھا کہ:

> 'جب کبھی (یورپ میں) انقلابی لہریں ایک لمحے کے لیے سہی دھیمی پڑ جاتی ہیں ایک قضیہ فوراً اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ ہے "قضیہ مشرق" (Eastern Question) چنانچہ انقلابِ فرانس کا زور ٹوٹا اور نپولین اور زار روس الکزانڈر نے صلح نامۂ ٹلسٹ (۱۸۰۷ء) کے بعد پورے یورپ کو آپس میں بانٹ لیا تو الکزانڈر نے عارضی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ترکی پر چڑھائی کردی تاکہ ان عناصر کو سہارا مل جائے جو اس زوال پذیر سلطنت کو اندر سے پارہ پارہ کرنے کے درپے تھے۔ اسی طرح لے باخ اور وی رونا کی کانگریسوں (۱۸۲۱ء۔۱۸۲۲ء) کے مطابق

مغربی یورپ کی انقلابی تحریکوں کو کچلنے کے فوراً ہی بعد الکزانڈر کے جانشین زار نکولس نے ترکی پر دوبارہ دھاوا کیا، پھر چند سال بعد جب فرانس کا جولائی ۱۸۳۰ء کا انقلاب ناکام ہوا اور پولینڈ، اٹلی اور بیلجیم کی بغاوتیں دبا دی گئیں اور یوں محسوس ہونے لگا گویا یورپ اب خانگی جھگڑوں سے چھٹکارا پا چکا ہے تو ۱۸۴۰ء میں ''قضیۂ مشرق'' نے پھر سر اٹھایا اور بڑی طاقتوں میں جنگ چھڑتے چھڑتے رہ گئی اور اب کہ (یورپ کے) تنگ نظر بالشتیے حاکم اس گھمنڈ میں ہیں کہ انہوں نے یورپ کو نراج اور انقلاب سے بچالیا ہے، پھر وہی سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ ہم ترکی کا کیا کریں'۔[۲]

'قضیۂ مشرق' دراصل ایک عیارانہ اصطلاح تھی جس کے پردے میں سلطنتِ عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کے منصوبے بنتے تھے۔ اس سازش کی ابتدا بقول مارکس ۱۸ویں صدی میں ہوئی چنانچہ ۱۹ویں صدی کے وسط تک جنوبی یونان، کریمیا، ٹرانس سلوینا، بسارے بیا اور مصر کے علاقے ترکی کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ 'مصر پر اب برطانیہ قابض ہے اور آئندہ بٹوارے میں یہ ملک اسی کو ملے گا'۔ مارکس آئندہ تقسیم کے بارے میں لکھتا ہے کہ 'مغربی طاقتوں کی کوشش ہوگی کہ اناطولیہ میں جہاں ترکی کی غالب اکثریت آباد ہے بہ دستور عثمانیوں ہی کی حکومت رہے البتہ ترکی کے یورپی مقبوضات اور فلسطین و لبنان کو ان سے چھین لیا جائے۔ جب کبھی قضیۂ مشرق کا ذکر چھڑتا ہے تو اس سے فقط فلسطین اور لبنان کی عیسائی وادیاں مراد ہوتی ہیں۔ حالانکہ اصل مسئلہ یورپی ترکی ہے۔ اس بڑے جزیرہ نما کا ہے جو دریائے ڈینوب اور دریائے ساوے کے جنوب میں واقع ہے'۔

فلسطین اور لبنان کی غیر مسلم اقلیتوں کی سرپرستی کا حق مغربی طاقتوں نے عثمانیوں سے بہ جبر حاصل کیا تھا۔ اس نام نہاد حق کو کے پی ٹولیشن (Capitulation) کہتے ہیں۔ اس رعایت کی اصل حقیقت بیان کرتے ہوئے مارکس نے لکھا کہ 'سلطان سلیمان اعظم نے ۱۵۳۵ء میں ایک شاہی فرمان کے ذریعے یورپی سوداگروں اور زائروں کو اسلامی علاقوں میں آزادی سے داخل ہونے، بےخوف و خطر کاروبار کرنے اور مقدس مقامات کی زیارت کرنے کی اجازت عطا کی تھی۔

یہ شاہی مراعات تھیں جن کو سلطان جب چاہتا منسوخ کرسکتا تھا۔[۳۲] (مغلوں نے بھی اسی طرح انگریزوں کو سورت اور کلکتہ میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی اجازت دے کر ان کو ملک میں قدم جمانے کا موقع دیا تھا) عثمانی سلطنت کمزور ہوئی تو یہ مراعات استحقاق میں تبدیل ہو گئیں۔ مگر مارکس نے اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ بیت المقدس اور فلسطین کے دوسرے متبرک مقامات پر مغربی طاقتیں جو حق جتاتی ہیں وہ سراسر بے بنیاد ہے۔ اس نے لکھا کہ:

'یروشلم میں چار ہزار مسلمان آباد ہیں، دو ہزار یونانی ہیں، ایک ہزار لاطینی، ۳۵۰ ارمنی، ۱۰۰ قبطی، ۲۰ سُریانی اور ۲۰ حبشی۔ گویا کُل غیر مسلم آبادی مجموعی طور پر بھی مسلمانوں سے کم ہے۔ یہ بھانت بھانت کے لوگ بیت المقدس کا گھیراؤ کیے ہوئے ہیں۔ وہاں آپس کی سر پھٹول میں پیش پیش کون ہے؟ راہب حضرات۔ ان کی باہمی رقابتوں کا بظاہر مقصد بیت الحم کے کسی غار کا ایک گوشہ ہے، عبادت گاہ کی کوئی مشجر چادر، حرم کی کنجی، عشاء ربانی کا چبوترہ یا کوئی یا گدا ہے جو بھی ہاتھ آجائے لیکن ان مذہبی دعووں کے پسِ پردہ بے شمار سیاسی اور قومی رقابتیں پوشیدہ ہیں۔'

جہاں تک یہودیوں کے دعووں کا تعلق ہے مارکس لکھتا ہے کہ:

'وہ سرے سے یہاں کے باشندے ہیں ہی نہیں بلکہ مختلف علاقوں اور دور دراز ملکوں سے آکر یہاں مقیم ہیں۔ یروشلم کی جانب ان کی کشش اس آرزو پر مبنی ہے کہ یہواہ (خدا) کی اس وادی میں رہتے ہوئے ان کو ان مقامات پر موت آئے جہاں مسیح موعود ظہور کریں گے۔'

عیسائیوں اور یہودیوں کا تحفظ تو فقط بہانہ تھا۔ یورپی طاقتوں کے اصل مقاصد اقتصادی اور سیاسی تھے۔ برطانیہ اور زار روس دونوں اس فکر میں تھے کہ کسی نہ کسی طرح سلطنتِ عثمانیہ کی تجارت اور مالیات پر قبضہ کرلیا جائے۔ چنانچہ اینگلز ایک خبر نامے میں لکھتا ہے کہ:

'ترکی میں اصل مسئلہ تجارتی اور سیاسی ہے۔ جب تک ہندوستان جانے کا بحری راستہ دریافت نہیں ہوا تھا (۱۴۹۸ء) قسطنطنیہ تجارت کی بہت بڑی منڈی تھا۔ اب ہر چند کہ ہندوستانی مال خشکی کی راہ ایران، توران اور ترکی سے گزر کر یورپ پہنچتا ہے پھر بھی ترکی کی بندرگاہیں یورپ اور

اندرونِ ایشیا جانے والے مالِ تجارت کی ترسیل اور کاروبار کے پھیلاؤ میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں اور ان کی سرگرمیاں تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ یہ بندرگاہیں وادیٔ دجلہ وفرات، ایران اور ترکستان جانے والے تجارتی قافلوں کے لیے مال اٹھانے کی سب سے بڑی منڈیاں ہیں۔ یونانی اور ارمنی سوداگر برطانوی مصنوعات بڑی مقدار میں درآمد کرتے ہیں۔ یہ سستی مصنوعات ایشیا کی مقامی مصنوعات کی جگہ بڑی تیزی سے لے رہی ہیں۔'

اینگلز لندن کے اخبار 'اکنامسٹ' مورخہ ۱۲ مارچ ۱۸۵۲ء کے حوالے سے لکھتا ہے کہ 'ترکی میں برطانوی مال کی درآمد جو ۱۸۴۰ء میں ۱۴ لاکھ ۴۰ ہزار ۵۹۲ پونڈ تھی ۱۸۵۰ء میں بڑھ کر ۳۷ لاکھ ۶۲ ہزار ۴۸۰ پونڈ ہوگئی ہے۔' اینگلز کی رائے میں برطانوی تجارت میں یہی اضافہ برطانیہ اور زارروس کے درمیان تصادم کا بنیادی سبب تھا۔ اینگلز لکھتا ہے کہ '۱۸۴۰ء تک اس علاقے پر غیر ملکی مصنوعات کی تجارت روسیوں کی اجارہ داری تھی۔ روسی مصنوعات جن کو بعض اوقات برطانوی مصنوعات پر ترجیح دی جاتی تھی دریائے سندھ کے کنارے تک پہنچتی تھیں۔ اینگلو افغان جنگ اور سندھ اور پنجاب کی فتح تک اندرونی ایشیا میں برطانوی تجارت صفر کے برابر تھی۔ تجارت کے دائرے کو پھیلانے کی کبھی ختم نہ ہونے والی ضرورت کے باعث انگریز تاجروں نے اندرونِ ایشیا پر دو سمتوں سے حملہ کیا ہے۔ دریائے سندھ کی جانب سے اور بحرِ اسود کی جانب سے۔'[۴]

جنگِ کریمیا (۱۸۵۳ء۔۱۸۵۶ء) کا بنیادی سبب بحرِ اسود کی بندرگاہوں اور اس علاقے کی تجارت کے دونوں دروازوں ___ آبنائے باسفورس اور درۂ دانیال ___ کی خاطر برطانیہ اور زارروس کے مابین رسہ کشی تھا۔

جنگ چھڑی اور برطانیہ اور فرانس نے روس کے خلاف ترکی کا ساتھ دیا تو مارکس اور اینگلز نے اپنے خبر ناموں میں روزمرّہ کے واقعاتِ جنگ پر تبصرہ کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ حریفوں کے ریاستی کردار سے بھی کھل کر بحث کی۔ ان کا اصل نشانہ برطانوی حکومت تھی جو ہر موقعے سے اقتصادی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہے مثلاً برطانیہ نے جنگ کے دوران ترکی کو پچاس لاکھ پونڈ قرض دیئے مگر 'قرضے کی شرطیں ایسی تھیں کہ ترکی کو ایک پونڈ بھی نقد نہ ملا۔ الٹے یہ ذلت آمیز شرط منظور کرنی پڑی کہ قرضے کی رقم کے نگراں انگریز کمشنر ہوں گے اور وہی رقم کی مناسب تقسیم بھی کریں گے۔ مغربی طاقتوں نے وزارتِ خارجہ کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ وزارتِ خارجہ ہی

کو نہیں بلکہ وزارتِ داخلہ کو بھی۔ ترکی اب اپنی فوج پر بھی اختیار سے محروم ہوگیا ہے اور مغربی طاقتیں ترکی کی مالیات پر بھی قبضے کے درپے ہیں۔ عثمانی سلطنت پہلی بار پبلک قرضوں کے معاہدے کررہی ہے لیکن قرضے کی رقمیں پائے بغیر۔ اس کی کیفیت اس مالک کی ہے جو نہ صرف اپنی املاک رہن رکھتا ہے بلکہ جو رقم ملتی ہے اس کو خرچ کرنے کا حق بھی مُرتہن کو دے دیتا ہے۔ بس اتنا ہی باقی رہ گیا ہے کہ وہ اصل املاک ہی سے دست بردار ہوجائے'۔ [۵]

مارکس کا شروع ہی سے یہ موقف تھا کہ برطانیہ نے جنگِ کریمیا میں خلوص اور نیک نیتی سے ترکوں کا ساتھ نہیں دیا ہے بلکہ اس کے پیشِ نظر اپنی سیاسی مصلحتیں ہیں۔ اس بات کا ثبوت خود برطانوی حکومت کی سرکاری دستاویزوں سے مل گیا جو ۱۸۵۶ء میں لڑائی کے اختتام پر شائع ہوئیں۔ مارکس نے ان دستاویزوں کی بنیاد پر اپریل ۱۸۵۶ء میں چار مضامین 'کرس کے سقوط' پر لکھے جو چارٹسٹوں کے اخبار 'پیپلز پیپر' میں شائع ہوئے (کرس کے قلعے میں ترک فوجیں محصور تھیں لیکن انگریزوں نے ان کی مدد سے انکار کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کرس پر روسیوں کا قبضہ ہوگیا) مارکس اس سانحے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

> 'کرس کا سقوط روس کے خلاف نقلی جنگ کی تاریخ کا اہم موڑ ہے......اور اگر ہم خود حکومت کی نیلی کتاب سے یہ ثابت کردیں کہ لارڈ پامرسٹن کی کابینہ نے شروع ہی سے کرس کے سقوط کا منصوبہ بنالیا تھا اور وہ آخر تک اس پر باقاعدگی سے کاربند رہی تو نقاب اٹھ جائے گا اور مشرقی جنگ کے ڈرامے اور اس کے حیرت انگیز واقعات پر ڈپلومیسی کی جو دُھند چھائی ہوئی ہے وہ چھٹ جائے گی'۔ [۶]

مارکس سرکاری دستاویزوں کے حوالے سے لکھتا ہے کہ جون ۱۸۵۵ء میں روسی فوجوں نے جب کرس کی ناکہ بندی شروع کی تو وزیراعظم علی محمد پاشا نے قسطنطنیہ میں لارڈ ریڈکلف، بریگیڈیئر منیز فیلڈ اور دوسرے اعلیٰ انگریز افسروں کو اپنے محل میں طلب کیا اور وزیرِ جنگ اور فواد پاشا کی موجودگی میں انگریزوں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ۴۳ ہزار کی فوج سے جس کی کمان انگریز جنرل وی وی یان (Vivian) کے ہاتھ میں ہو، روسی گرجستان میں پیش قدمی کی جائے اور طفلس پر قبضہ کرلیا جائے۔ اس طرح کرس پر روس کا دباؤ ختم ہوجائے گا۔ لارڈ ریڈکلف نے اس تجویز کا

متن لندن بھیج دیا اور دو ہفتے بعد یاددہانی کے طور پر دوسرا مراسلہ بھی روانہ کیا لیکن وزیرِ خارجہ لارڈ کلے رینڈن (Clarendon) اور وزیرِ جنگ لارڈ پین مور (Panmure) دونوں نے اس تجویز کی شدت سے مخالفت کی حالانکہ بقول مارکس 'ترکوں نے کرس پر دباؤ ختم کرنے کا بہترین منصوبہ پیش کیا تھا لیکن اتحادیوں نے اس پر عمل نہ ہونے دیا'۔ [7]

غرض یہ کہ مارکس نے انگریز وزیروں، سفیروں اور جنرلوں کے مراسلوں، تاروں اور بیانوں کے حوالوں سے ثابت کردیا کہ انگریزوں کا کوئی ارادہ کرس کو بچانے کا نہ تھا۔

مارکس برطانیہ اور فرانس کی سیاسی حکمتِ عملی سے بھی بخوبی واقف تھا۔ ہرچند کہ ان دونوں ملکوں کی فوجیں زارروس کے خلاف لڑ رہی تھیں مگر بقول مارکس ان کی پوری کوشش تھی کہ 'کریمیا کی جنگ زارروس کے خلاف عوام کی جنگ میں تبدیل نہ ہونے پائے کیونکہ اس صورت میں مغربی یورپ کی جمہوریت دشمن حکومتوں کے نظام کے تہہ و بالا ہو جانے کے خطرات شدید ہو جاتے'۔ اسی بنا پر مارکس اس جنگ کو 'نقلی جنگ' کہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یورپ کے عوام اس جنگ کی اصل حقیقت سے جلد آگاہ ہو جائیں گے۔ مارکس اور اینگلز کو یقین تھا کہ شرکائے جنگ کو جو مالی اور جانی نقصانات ہو رہے ہیں ان کی وجہ سے یورپ میں عنقریب اقتصادی بحران کی صورت پیدا ہو جائے گی اور تب انقلابی قوتوں کے دوبارہ ابھرنے کے امکانات روشن ہوں گے۔ وہ سمجھتے تھے کہ نام نہاد 'قضیۂ مشرق' نہ جنگ سے طے ہو سکتا ہے نہ ڈپلومیسی سے بلکہ 'ترکی کا مسئلہ دوسرے بڑے مسئلوں کے ساتھ فقط یورپی انقلاب ہی سے حل ہو سکے گا۔ بہ ظاہر یہ بات بہت بعید از قیاس نظر آتی ہے لیکن انقلابی منزل کے نشان ۱۷۸۹ء کے انقلابِ فرانس کے بعد سے برابر آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ انقلاب کی آخری چوکیاں وارسا، دِب ریک زین اور بخارسٹ تھیں۔ انقلاب کی آئندہ چوکیاں پیٹرس برگ (روس کا دارالسلطنت) اور قسطنطنیہ ہوں گی'۔ [8]

برطانیہ اور فرانس کی جنگی حکمتِ عملی پر تنقید کرتے ہوئے مارکس نے لکھا کہ:

> 'انقلابی عواقب و نتائج سے بچنے کی غرض سے روس کے فقط ان علاقوں میں فوجی پیش قدمی کی گئی ہے جو بہت پس ماندہ ہیں اور انقلابی اور قومی تحریکوں کے مراکز سے فاصلے پر ہیں ''لوکل جنگ لوکل مقاصد کے لیے'' کا شوشا اسی غرض سے چھوڑا گیا ہے۔ اینگلو فرانسیسی حکمتِ عملی کا بنیادی نکتہ

یہی ہے کہ جنگِ کریمیا کو زارشاہی کے خلاف عوامی جنگ بننے سے روک دیا جائے'۔[9]

برطانوی حکومت کی نظر میں اپنے ہندوستانی مقبوضات کا بچاؤ بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ برطانوی حکمتِ عملی کے اس پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے مارکس لکھتا ہے کہ:

'ہر چند کہ جان بُل (برطانیہ) وقتاً فوقتاً ہندوستان میں علاقے تسخیر کرتا رہتا ہے مگر وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا اس کے مقبوضات کے قرب و جوار میں ایسا کرے۔ روس وہ ملک جس کی جانب سے انگریز مدت سے فکرمند ہے۔ مشرقِ وسطیٰ اور تربیزون کی بندرگاہ کے ذریعے اندرونِ ایشیا میں انگریزوں کی روزافزوں تجارت کے پیشِ نظر درۂ دانیال میں آزاد بحری نقل و حرکت برطانیہ کے لیے انتہائی اہم ہے۔ اس کے علاوہ وسطی ایشیا میں روسی اقدام سے متعلق جو طرح طرح کی مبہم افواہیں پھیلی ہوئی ہیں ہندوستانی سیاست داں ان کو خوب ہوا دیتے ہیں اور ان باتوں کو یہاں انگریزوں کی جغرافیائی لاعلمی کی وجہ سے سچ مان لیا جاتا ہے'۔[10]

اور یہ واقعہ ہے کہ ہندوستانی اخباروں بالخصوص دہلی کے اردو اخباروں میں ان دنوں آئے دن یہ خبریں چھپتی تھیں کہ روس کی فوجیں ہندوستانی سرحد کی طرف بڑھ رہی ہیں اور وہ یہاں آ کر انگریزوں کو نکال باہر کریں گی۔

مغربی طاقتوں نے جنگ میں ترکی کی حمایت اپنے سیاسی مفادات کے پیشِ نظر کی تھی۔ ان کے اخباروں اور سیاست دانوں کا یہ دعویٰ کہ ہم 'آزادی' اور 'تہذیبِ انسانی' کے حق میں اور 'استبداد' کو زک دینے کی خاطر میدانِ جنگ میں اترے ہیں سراسر جھوٹ تھا۔ مارکس اور اینگلز نے اپنے مضامین میں ان دعووں کی اصل حقیقت کھول کر بیان کر دی اور لکھا کہ:

'یہ جنگ دراصل مغربی طاقتوں سے حکمراں طبقوں کے اقتصادی اور عسکری مفادات کے مابین تصادم کا نتیجہ ہے۔ یہ طاقتیں عثمانی سلطنت کے بٹوارے اور بلقان اور بحرِ اسود کی گذرگاہوں پر غلبے کی خاطر آپس

میں لڑ رہی ہیں ورنہ مغرب کی انقلاب دشمن طاقتیں بلقان کی محکوم قوموں
کی آزادی کی جدوجہد سے نہ کوئی دلچسپی رکھتی ہیں اور نہ ان قوموں کے
مفادات کا تحفظ ان کے نظامِ کار میں شامل ہے۔[11]

مارکس اور اینگلز کی رائے میں برطانیہ اور فرانس کی حکومتیں یہ ضرور چاہتی تھیں کہ زار روس کا اثر و رسوخ بلقان اور مشرقِ وسطیٰ میں گھٹ جائے، کریمیا اور قفقاز کے علاقے اس سے چھن جائیں اور روس کا بحری بیڑا تباہ ہو جائے لیکن وہ زار شاہی کے خاتمے کے حق میں ہرگز نہ تھیں۔ 'زار روس کو وہ مشرقی یورپ کی عوامی تحریکوں کو دبانے کا فریضہ سپرد کرنا چاہتی ہیں۔ یہ ڈر بھی ستاتا ہے کہ زار شاہی ختم ہوئی تو یورپ میں ۱۸۱۵ء کی کانگریس آف ویانا کے تحت جس سیاسی نظام کی طرح ڈالی گئی تھی کہیں وہ تہہ و بالا نہ ہو جائے۔ 'جنگِ کریمیا کا مقصد اس نظام کو برباد کرنا نہیں بلکہ اس کو ترکی کی شمولیت سے اور مستحکم کرنا ہے'۔[12]

مارکس اور اینگلز جنگِ کریمیا کو یورپ کے جمہوری انقلاب کے پس منظر میں دیکھتے تھے اور یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کیا اس جنگ کو محکوم قوموں کی آزادی میں (جس میں ترکوں کی تابع بلقانی قوموں کی آزادی بھی شامل تھی) بدلا جا سکتا ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ اس کا انحصار یورپ کی پرولتاریہ اور انقلابی عوام کی سرگرمیوں پر ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے خبرناموں میں مزدور طبقے اور انقلابی جمہوریت پسندوں کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ اس جنگ سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے انقلاب دشمن حکومتوں کے خلاف جدوجہد تیز کر کے۔ مارکس کو توقع تھی کہ حالات نے اگر انقلابی صورت اختیار کی تو 'محنت کش طبقہ اپنا وہ کھویا ہوا مقام پھر حاصل کر لے گا جو جون ۱۸۴۸ء میں اس نے فرانس میں ہاتھ سے جانے دیا تھا، فقط فرانس ہی میں نہیں بلکہ برطانیہ سمیت پورے یورپ میں'۔[13]

اس ضمن میں مارکس اور اینگلز کو فرانس کے محنت کشوں سے بڑی توقعات تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اب کے فرانس میں انقلاب آیا تو یورپ کی محکوم قوموں کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی اور 'آج کل کے مہمل اور بے معنی اتحادوں اور مخاصمتوں کے بجائے یورپ ایک بار پھر دو کیمپوں میں بٹ جائے گا جن کے پرچم جدا ہوں گے اور مسائل نئے۔ اس وقت مقابلہ جمہوری انقلاب اور انقلاب دشمن ملوکیت کا ہوگا۔ جنگ سے چھٹکارا پانے کا واحد طریقہ جمہوری انقلاب ہی ہے'۔[14]

مگر جنگ کریمیا سے مارکس اور اینگلز کو جو توقعات تھیں وہ تو پوری نہ ہوئیں البتہ روس کے فیوڈل نظام کی فرسودگی سب پر ظاہر ہوگئی اور زار روس کو بالآخر کسانوں کی آزادی کا اعلان کرنا پڑا۔ روس میں سَرف ڈم کا خاتمہ ہوگیا۔

مارکس نے ترکوں کے بارے میں 'نیویارک ڈیلی ٹری بیون' میں جو کچھ لکھا ترکوں کو شاید اس کی خبر بھی نہ ہوئی ہو لیکن ترکی کا تعلیم یافتہ طبقہ جدید مغربی افکار اور میلانات سے سلطان محمود ثانی (۱۸۰۸ء۔۱۸۳۹ء) کے عہد سے آہستہ آہستہ واقف ہوتا جارہا تھا (تفصیل کے لیے دیکھیے مصنف کی کتاب 'نوید فکر' باب سوئم) تنظیمات کے دور میں یہ رجحان اور بڑھا اور ابراہیم شناسی، نامق کمال، ضیا پاشا اور مصطفیٰ فاضل پاشا وغیرہ کی کوششوں سے جنہوں نے پیرس میں تعلیم پائی تھی ریڈیکل خیالات کا چرچا ہونے لگا۔ نامق کمال (۱۸۴۰ء۔۱۸۸۸ء) پیرس کمیون کے زمانے میں (۱۸۷۰ء) پیرس میں تھا۔ اس کی شاعری پر پیرس کمیون کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ وہ براہِ راست سوشلزم کی بات تو نہیں کرتا مگر 'افتادگان خاک' اور 'ستم رسیدگان استبداد' سے ہمدردی کا اظہار جس انداز سے کرتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سوشلسٹ اصولوں سے ناواقف نہیں۔ سلطان عبدالعزیز پیرس کمیون سے اتنا ڈرا کہ اس نے نامق کمال سمیت بہت سے ادیبوں اور دانش وروں کو قسطنطنیہ بھیج دیا۔

قسطنطنیہ ان دنوں ایرانی انقلابیوں کی پناہ گاہ بھی تھا۔ انہوں نے سلطان ناصرالدین شاہ قاچار کے مظالم سے تنگ آکر قسطنطنیہ، قاہرہ، لندن اور کلکتہ میں پناہ لی تھی۔ وہ فارسی میں اخبار اور رسالے شائع کرتے اور خفیہ طور پر ایران میں تقسیم کرتے تھے۔ ایسا ہی ایک اخبار 'اختر' تھا۔ اس میں پیرس کمیون کی نویں سالگرہ کے موقع پر ایک مضمون چھپا تھا جس کو اخبار 'ایران' نے 'بہ مناسبت ہنم سال عزد پیرس کمیون' کے عنوان سے ۱۸۸۰ء میں شائع کیا تھا۔ پیرس کمیون کی انقلابی جدوجہد پر تبصرہ کرتے ہوئے مضمون نگار نے لکھا تھا کہ:

> 'سوشلسٹ اشخاص کے اپنے خیالات روز بروز زیادہ مقبول ہوتے جاتے ہیں۔ یہ لوگ گذشتہ بیس برس میں اس مہم میں مصروف ہیں۔ پیرس کمیون کی شکست کے باوجود سوشلسٹوں کی سرگرمیاں بدستور جاری ہیں۔ وہ روس میں زیادہ مصروفِ عمل ہیں۔ وہ ہر قسم کے استحصال کو ختم کرنے کے

خواہش مند ہیں اور ذرائع پیداوار کو سماجی ملکیت بنانا چاہتے ہیں۔
سوشلسٹوں کا خیال ہے کہ زمین ایک مکان کی مانند ہے اور اس میں رہنے
بسنے والے بہ منزلہ ایک خاندان کے ہیں۔ لہٰذا ان کے بقول لوگوں کو
بھائیوں کی طرح رہنا چاہیے۔ بادشاہ اور استبدادی حکومت کی کوئی گنجائش
نہیں ہونی چاہیے اور بنی نوع انسان کو ہلاک کرنے کی خاطر اسلحے تیار کرنا
اور ان کو بیچنا خریدنا فعل عبث ہے۔'

اس اقتباس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ کم از کم قسطنطنیہ کے انقلابی حلقے سوشلسٹ خیالات سے کسی حد تک ضرور آشنا تھے مگر سنسر شپ کی پابندیوں کے باعث سوشلزم کی تبلیغ کھل کر نہیں کر سکتے تھے۔ سنسر شپ کی سختیوں کا یہ عالم تھا کہ خالدہ ادیب خانم کے بقول سلطان عبدالمجید ثانی نے 'آئین'، 'آزادی' اور 'مادرِ وطن' قسم کے الفاظ کا استعمال خلاف قانون اور سزاوار سرزنش قرار دے دیا تھا۔[15]

سید جمال الدین افغانی بھی جو اتحادِ اسلامی کے بڑے علم بردار اور مغربی استعمار کے سخت دشمن تھے سوشلسٹ نظریات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اپنے آخری دنوں میں جب وہ قسطنطنیہ میں مقیم تھے انہوں نے کسی ترک قلم کار کے استفسار پر ایک طویل مقالہ 'اشتراکیت' پر لکھا اور دعویٰ کیا کہ 'اشتراکیت' خلافِ دین نہیں بلکہ دین کے عین مطابق ہے۔'[16]

افغانستان

اخبار 'نیویارک ہیرلڈ ٹری بیون' کے مالک ایڈیٹر چارلس ڈانا نے ۱۸۵۷ء میں ایک انسائیکلوپیڈیا 'نیو امریکن انسائیکلوپیڈیا' کے نام سے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور مارکس کو اس کے لیے مضامین لکھنے کی دعوت دی۔ اینگلز کے مشورے پر مارکس نے ڈانا کی دعوت منظور کر لی اور دونوں نے ۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۰ء کے درمیان انسائیکلوپیڈیا کے لیے ۸۱ مضامین تحریر کیے۔ یہ انسائیکلوپیڈیا ۱۸۶۳ء میں سولہ جلدوں میں چھپی۔ مارکس اور اینگلز کے زیادہ مضامین فوجی موضوعات پر تھے جن میں فوج اور متعدد اسلحوں کی تاریخ بیان کی گئی تھی البتہ تین مضامین کا تعلق مشرق سے تھا۔ افغانستان، الجزائر اور برما پر یہ مضامین جن کا مصنف اینگلز تھا، خالص معلوماتی

تھے پھر بھی اینگلز نے ان میں سرمایہ دار طاقتوں کی مقبوضاتی حکمتِ عملی کی مذمت کھل کر کی اور ایشیا اور افریقہ کے لوگوں کو غلام بنانے اور ان کا استحصال کرنے کی غرض سے مغربی حکومتیں جو طریقے اختیار کرتی ہیں ان کو وضاحت سے بیان کیا۔

۱۹ ویں صدی کے وسط میں افغانستان اور ایران کی بابت برطانوی حکمتِ عملی کا محور ہندوستان تھا۔ سندھ اور پنجاب پر قبضے کے بعد سلطنتِ برطانیہ کی سرحد درۂ خیبر تک پہنچ گئی تھی مگر اس تسخیر سے پہلے بھی انگریز اپنے تجارتی مقاصد کی خاطر افغانستان اور ایران کو زیرِ اثر لانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ تجارت کے علاوہ سیاسی غرضیں بھی تھیں مثلاً زار روس کی جانب سے برابر دھڑکا لگا رہتا تھا کہ مبادا وہ افغانستان کی راہ سے تاجِ برطانیہ کے سب سے قیمتی ہیرے کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ ۱۸۳۸ء۔ ۱۸۴۲ء کی اینگلو افغان جنگیں اسی احمقانہ سوچ اور مجرمانہ طرزِ عمل کا شاخسانہ تھیں۔ ان جنگوں میں انگریزی فوجوں کو جو زک اٹھانی پڑی اس سے زمانہ واقف ہے۔

اینگلز نے اگست ۱۸۵۷ء میں انسائیکلوپیڈیا کے لیے افغانستان پر جو مقالہ رقم کیا اس میں ملک کے طبعی حالات، آبادی، رقبہ اور مختصر تاریخ کے علاوہ پہلی اینگلو افغان جنگ میں انگریزوں کے شکست کی داستان تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ برطانوی مہم سے پیشتر ہندوستان پر جتنے حملے بھی ہوئے وہ افغانستان ہی کی راہ سے ہوئے۔ محمود غزنوی، چنگیز، تیمور لنگ اور نادر شاہ سب نے یہی راستہ اختیار کیا۔ نادر شاہ کی وفات کے بعد احمد شاہ نے جس کی فوجی تربیت نادر شاہ کے لشکر میں ہوئی تھی ۱۷۴۷ء میں ایرانی غلامی کا جوا اُتار پھینکنے کا عزم کیا۔ ۱۷۴۸ء میں اس نے کابل اور پشاور کے صوبیدار کو مار بھگایا اور دریائے سندھ کو عبور کر کے پنجاب کو خوب لوٹا۔ ۱۷۷۲ء میں احمد شاہ کی وفات پر اس کا بیٹا تیمور شاہ تخت نشین ہوا تو اس نے قندھار کی جگہ کابل کو دارالحکومت بنایا۔ ۱۷۹۳ء میں تیمور شاہ کی وفات پر اس کے جانشینوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اسی اثنا میں فرانس اور برطانیہ کی باہمی رقابت کے شعلے بھی کابل تک پہنچنے لگے۔ ۱۸۰۹ء میں نپولین نے جنرل ژاردین کو ایران بھیجا تا کہ وہ فتح علی شاہ قاچار کو ہندوستان پر حملہ کرنے پر آمادہ کرے۔ اس کی توڑ میں انگریزوں نے ماؤنٹ سٹورٹ ایلفنسٹن کو شاہ شجاع والیٔ افغانستان کے دربار میں روانہ کیا۔ اس دوران مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پشاور تک کا علاقہ افغانوں سے چھین کر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۱۸۳۵ء میں جن دنوں کابل میں امیر دوست محمد خاں برک زئی کی حکومت تھی اور برطانیہ اور

روس ایران اور وسطی ایشیا میں ایک دوسرے کے خلاف سازش میں مصروف تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی معاہدے کی آڑ میں کپتان الیکزانڈر برنس کو کابل بھیجا۔ اس نے دوستانہ معاہدے کی پیش کش کی جس کو دوست محمد نے بخوشی منظور کر لیا لیکن اینگلو انڈین حکومت اس سے ہر چیز کی طلبگار تھی البتہ اس کے عوض میں کچھ بھی دینے کو تیار نہ تھی۔۔۔ پھر جب ۱۸۳۸ء میں ایران نے روس کی مدد اور مشورے سے ہرات کا محاصرہ کر لیا جو افغانستان اور ہندوستان کی کنجی ہے۔۔۔ دوست محمد نے انگریزوں کی حمایت کی بہتیرا کوشش کی مگر انگریز ٹال مٹول کرتے رہے۔ آخر دوست محمد کو چارو ناچار ایرانی اور روسی نمائندوں سے بات چیت کرنی پڑی۔ برنس ناکام لوٹا تب گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ نے اپنے سیکریٹری ڈبلیو میک ناٹن کے کہنے پر امیر دوست محمد کو سزا دینے کا فیصلہ کیا حالانکہ خود انگریزوں کے طرزِ عمل نے اس کو ایران اور روس کی جانب جھکنے پر مجبور کیا تھا۔ [۷۱]

افغانستان پر چڑھائی کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اینگلز لکھتا ہے کہ 'انگریزی فوج مارچ ۱۸۳۹ء میں سندھ سے گزر کر درۂ بولان کی راہ سے قندھار میں داخل ہوئی۔ غزنی اور کابل پر بلا لڑے قبضہ ہو گیا اور انگریزوں نے ۶ راگست کو شاہ شجاع کو تخت پر بٹھا دیا مگر سرجان کے لکھتا ہے کہ:

> 'شاہ شجاع کا جلوس تخت نشینی کسی جنازے کا جلوس نظر آ رہا تھا لیکن افغان قوم فرنگیوں کی غلامی برداشت نہیں کر سکتی تھی چنانچہ ۱۸۴۰۔۱۸۴۱ء کے دوران جگہ جگہ بغاوتیں ہوتی رہیں اور انگریزی فوج مستقل حرکت کرتی رہی۔ دوست محمد خان نے ہتھیار ڈال دیئے اور کلکتہ بھیج دیا گیا۔'

اینگلز لکھتا ہے کہ:

> 'ہر چند کہ اس جنگ کا ایسٹ انڈیا کمپنی کے مفادات سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن افغان مہم کے تمام اخراجات جو ساڑھے بارہ لاکھ سالانہ تھے ہندوستان کے کھاتے میں ڈال دیئے گئے۔ شاہ شجاع کے اخراجات اور افغان سرداروں کے وظیفے اس پر مستزاد تھے مگر آخر کار جب انگریزوں کو پسپا ہو کر واپس لوٹنا پڑا تو افغانوں کے جوابی حملے میں پورا لشکر جس کی تعداد ےاہزار تھی ہلاک ہو گیا۔ فقط ایک شخص ڈاکٹر برائیڈن زندہ بچا۔ شاہ شجاع قتل ہوا اور انگریزوں کو دوست محمد خان کو رہا کرنا پڑا۔ وہ ۱۸۶۳ء تک

زندہ رہا۔اینگلو افغان جنگ میں بیس ہزار سپاہی مارے گئے اور ڈیڑھ کروڑ پونڈ خرچ ہوئے۔یہ سارا بوجھ ہندوستان کو برداشت کرنا پڑا۔[۱۸]

ایران

برطانیہ، روس اور فرانس ۱۹ویں صدی کے اوائل ہی سے ایران میں قدم جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ نپولین کی پسپائی کے بعد برطانیہ اور روس کی ریشہ دوانیاں اور بڑھ گئیں۔۱۸۱۳ء میں زار روس نے 'صلح نامۂ گلستان' کی رُو سے چند مراعات حاصل کرلیں مگر نومبر ۱۸۱۴ء میں انگریز صلح نامۂ تہران کے بعد روس پر سبقت لے گئے اور وہ تمام معاہدے منسوخ اور کالعدم قرار پائے جو ایران نے برطانیہ کی دشمن کسی مغربی طاقت سے کیے ہوں۔مزید براں یہ بھی طے پایا کہ برطانیہ کے کسی دشمن کی فوج ایران میں داخل ہونے کی مجاز نہ ہوگی۔ یہ پیش بندی اس لیے تھی کہ روسی فوجیں ایران سے گزر کر ہندوستان کی جانب نہ بڑھنے پائیں لیکن شاہ عباس مرزا کے بیٹے شاہ محمد مرزا کا (جو ۱۸۳۳ء میں تخت پر بیٹھا) جھکاؤ روس کی جانب تھا لہٰذا شاہی دربار میں روس کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا اور روس نے شاہ کو ہرات پر حملہ کرنے پر اُکسایا جو ایران اور افغانستان کی سرحد کے قریب واقع ہے اور کسی زمانے میں ایرانی سلطنت کا حصہ تھا (۱۸۳۷ء)۔مگر انگریزوں نے مداخلت کی دھمکی دی تو ایران کو ہرات کا محاصرہ ترک کرنا پڑا۔

جنگِ کریمیا کے بعد زار روس نے ایرانیوں کو دوبارہ ہرات پر قبضے کا لالچ دیا۔زار کا خیال تھا کہ اینگلو افغان جنگ کے بعد انگریز ہرات کے معاملے میں افغانستان کی مدد نہ کرسکیں گے۔ چنانچہ ۱۸۵۶ء میں ایران نے ہرات پر قبضہ کرلیا۔انگریزوں نے شاہ ایران کی اس بدعہدی کو عذر بنا کر اپنی فوجیں ایران کے جنوبی ساحل پر اتار دیں اور خلیجِ فارس کے جزیرۂ خرج پر قبضہ کرلیا جو مارکس کے بقول 'ترکی، عربستان اور ایران کی تجارت کا مرکزی نقطہ ہے۔' وہ انگریزوں کی فوجی مداخلت کا حقیقی مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

> 'انگلستان بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایران کے خلاف جو اعلانِ جنگ کیا ہے وہ دراصل مکاری اور عیاری کی اس چال کا ہو بہو چربہ ہے جس کے ذریعے انگلستان نے ایشیا میں اپنے مقبوضات کو وسعت دی ہے۔ جوں

ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی للچائی نظریں کسی خودمختار فرماں روا یا کسی ایسے علاقے پر پڑتی ہیں جس کے سیاسی اور تجارتی ذخیرے یا زر و جواہر بیش قیمت ہیں تو شکار پر کسی نہ کسی فرضی یا حقیقی معاہدے یا فرضی وعدے کی خلاف ورزی کرنے کا الزام لگا دیا جاتا ہے اور تب جنگ کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اس بدی کی تجدید ہوتی ہے جو بھیڑیے اور میمنے کی حکایت کا ماحصل ہے۔[19]

الجزائر

یہی وہ زمانہ تھا کہ جب الجزائر میں فرانسیسی غلبے کے خلاف آزادی کی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ فرانسیسیوں نے ہر چند کہ الجزائر کے قومی ہیرو عبدالقادر کو گرفتار کر کے پیرس بھیج دیا تھا مگر اندرونِ ملک شورش بدستور جاری تھی۔ چنانچہ اینگلز نے ۱۸۵۷ء میں امریکی انسائیکلوپیڈیا کے لیے الجزائر پر جو مضمون لکھا اس میں اینگلز نے فرانسیسیوں کے ظلم و ستم کی شدت سے مذمت کی اور الجزائر کے مجاہدین آزادی کی سرفروشیوں کو خوب سراہا۔ وہ الجزائر کے طبعی حالات بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ:

'الجزائر کے باشندے بربر کہلاتے ہیں۔ ان کی قدیم تاریخ کے بارے میں بس اتنا معلوم ہے کہ ایک زمانے میں یہ لوگ پورے شمال مغربی افریقہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ زیادہ تر کوہستانی علاقوں میں آباد ہیں۔ دوسری قوم عرب ہے جو (۸ویں، ۹ویں صدی) مسلمان حملہ آوروں کی اولاد ہے۔ ان کے علاوہ الجزائر میں ترک، یہودی، نیگرو اور تھوڑے سے فرانسیسی بھی موجود ہیں۔ ۱۸۵۲ء میں الجزائر کی کُل آبادی ایک لاکھ ۳۴ ہزار تھی۔ یورپی نژاد آبادکاروں کی تعداد ایک لاکھ ۳۴ ہزار ہے۔ ایک لاکھ فرانسیسی فوج ان کے علاوہ ہے۔

'بربر بڑے محنتی اور جفاکش لوگ ہیں۔ وہ گاؤں میں رہتے ہیں اور بہت اچھے کاشتکار ہیں۔ وہ کانوں اور اونی سوتی فیکٹریوں میں بھی کام

کرتے ہیں اور دھات کی چیزیں، بارود اور صابن بھی بناتے ہیں اور شہد اور موم جمع کرتے ہیں اور شہر والوں کو مرغی، پھل اور کھانے کی دوسری چیزیں سپلائی کرتے ہیں۔ عرب اپنے پُرکھوں کی تقلید کرتے ہوئے خانہ بدوشی اور صحرا نوردی کی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اپنے مویشیوں کے لیے گھاس چارے کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

'الجزائر پر پہلے رومنوں نے قبضہ کیا۔ پھر (پانچویں صدی عیسوی میں) ونیڈل نامی ایک جرمن قوم ان پر حاوی ہوئی اور تب عرب آئے۔ ۱۴۹۲ء میں اسپین کے فرماں روا شاہ فرڈی نند نے الجزائر پر چڑھائی کی اور، اوران بوغیا اور شہر الجزائر پر قبضہ کرلیا۔ ہسپانیوں سے نمٹنے کی خاطر امیر سلیم قطیمی نے ترکوں سے کمک کی درخواست کی چنانچہ مشہور جنرل حارث باربروسا کو اس کی مدد کے لیے بھیجا گیا (۱۵۱۶ء)۔ مگر وہ ۱۵۱۶ء میں طبلیس کے محاصرے میں مارا گیا۔ اس کے بھائی اور جانشین خیرالدین باربروسا کو سلطان سلیم اوّل نے پاشا کے خطاب سے نوازا اور الجزائر کو عثمانی سلطنت کا خودمختار علاقہ تسلیم کرلیا اور فوج مدد کے لیے بھیجی۔ خیرالدین نے ہسپانیوں کو مار بھگایا۔ ۱۵۴۱ء میں اسپین کے بادشاہ چارلس پنجم نے تیس ہزار سپاہیوں اور ۳۷۰ جنگی جہازوں کے ساتھ الجزائر پر دوبارہ حملہ کیا لیکن زلزلے اور طوفان سے اس کی فوج تباہ ہوگئی۔ اس کے بعد کبھی انگریز، کبھی فرانسیسی اور کبھی ڈچ الجزائر پر حملے کرتے رہے۔'

الجزائر تقریباً ڈیڑھ سو سال تک عثمانیوں کے زیرِ نگیں رہا لیکن داعی ابراہیم نے ۱۷۰۵ء میں آخری ترک پاشا کو نکال باہر کیا البتہ وہ قسطنطنیہ کو کبھی کبھار تحفے تحائف بھیج کر اپنی برائے نام اطاعت کا یقین دلاتا رہا لیکن خراج ادا کرنے کا سلسلہ یک قلم موقوف ہوگیا۔

اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب نپولین برسرِ اقتدار آیا تو اس کی جہانبانی کی ہوس الجزائر پر قبضہ کرنے کے منصوبے بھی بنانے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ فرانسیسی مصنوعات کی نکاسی کے لیے

الجزائر کے بازار بہت مناسب رہیں گے اور الجزائر کی تسخیر سے وسطی افریقہ کا وسیع وعریض علاقہ بھی آسانی سے فرانس کے زیرِ اثر آ سکے گا۔ چنانچہ ۱۸۰۸ء میں زار روس الکزانڈر اوّل سے سلطنتِ عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کی بابت جو گفتگوئیں ہوئیں ان میں نپولین نے الجزائر کو فرانسیسی سلطنت میں شامل کرنے پر بار بار زور دیا۔

نپولین کا خواب تو پورا نہ ہوا البتہ چارلس دہم (۱۸۲۴ء۔۱۸۳۰ء) نے فرانسیسی عوام کی توجہ ملکی مسائل سے ہٹانے کی غرض سے اور فرانسیسی نوابوں کو جن کی زمینیں انقلاب کے دوران ضبط ہوئی تھیں الجزائر میں جاگیریں عطا کرنے کا سبز باغ دکھا کر الجزائر پر حملہ کر دیا۔ ۳۸ ہزار سپاہی اور چار ہزار گھڑ سوار جنرل بورموں کی کمان میں ۱۳ جون ۱۸۳۰ء کو الجزائر پر حملہ آور ہوئے۔ حسین بے نے خفیف مقاومت کے بعد ہتھیار ڈال دیئے اور فرانسیسیوں کو مالِ غنیمت میں بارہ جنگی جہاز، ۱۵ سو توپیں اور دس کروڑ ڈالر نقد ہاتھ آئے۔ اینگلز اس قزاقانہ لوٹ مار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

> 'الجزائر پر فرانسیسیوں کے قبضے کے پہلے دن سے آج تک یہ بدنصیب ملک مسلسل خوں ریزی، قتل وغارت گری، لوٹ مار اور تشدد کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ ہر چھوٹے بڑے شہر اور قصبے کی تسخیر میں بے شمار جانیں ضائع ہوئی ہیں۔ عربوں اور بربروں کو اپنی آزادی بہت عزیز ہے اور وہ غیر ملکی غلبے سے نفرت کرنے میں اپنی جان کی پروا بھی نہیں کرتے۔ ان کو بڑی سفاکی سے کچلا گیا ہے ان کے گھر بار اور املاک کو جلا کر خاک کر دیا گیا ہے، کھڑی فصلیں کاٹ لی گئی ہیں اور جو قتل ہونے سے بچ گئے ہیں (عورتیں) وہ فرانسیسیوں کی ہولناک درندگی اور ہوسناکی کا شکار ہیں۔ جنگ کے اس بہیمانہ طریقے کو انسانیت، تہذیب اور مذہب کے تمام اصولوں کے خلاف روا رکھا گیا ہے۔'

اینگلز کا یہ مضمون 'مہذب' فرانسیسیوں کے طرزِ عمل کی سچی تصویر ہے۔

> 'ہر نیا گورنر اپنے پیش رو کے مظالم کی تجدید کرتا ہے۔ شاہی فرمانوں میں تو بڑے قابلِ ستائش ارادوں کا اعلان کیا جاتا ہے لیکن فوج کی سفاکیوں

میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اب الجزائر کی حیثیت کالے پانی کی ہے جہاں ان سب اشخاص کو جلاوطن کیا جاتا ہے جن کو وزیرِ داخلہ سیاسی یا معاشی خطرہ تصور کرتا ہے۔ ۱۸۳۲ء میں الجزائریوں کی جانب سے فرانسیسی پارلیمنٹ میں ایک محضر پیش ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ ''تین سال سے ہم لوگ ہر ممکن ناانصافی برداشت کر رہے ہیں۔'' جب حکام سے شکایت کی جاتی ہے تو جواب میں مزید تشدد ہوتا ہے بالخصوص ان افراد پر جو شکایت کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شخص منہ کھولنے کی جرأت نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس محضر پر کسی کے دستخط نہیں۔ حضرات! ہم آپ سے انسانیت کے نام پر درخواست کرتے ہیں کہ خدارا ہم کو اس جبر واستبداد سے نجات دلوایئے۔ ہم کو اس ظالم غلامی سے آزاد کروایئے۔ اگر ملک اسی طرح مارشل لاء کے تحت رہا، اگر سول حکومت قائم نہ کی گئی تو ہم ہلاک و برباد ہو جائیں گے ہم کو کبھی امن وچین نصیب نہ ہوگا۔'

انسائیکلوپیڈیا کے ایڈیٹروں نے اینگلز کے مقالے سے بغاوتوں بالخصوص عبدالقادر کی نبرد آزمائیوں کی تفصیلات خارج کر دیں پھر بھی جابجا اشارے مل ہی جاتے ہیں۔ مثلاً بنوسلم کی بغاوت جو ۱۸۴۹ء میں ہوئی۔ 'جنرل پلپے سیٹر نے بنوسلم سمیت کئی قبیلوں پر چڑھائی کی اور ان کی فصلیں جلا ڈالیں اور ان کی املاک برباد کر دیں کیونکہ انہوں نے خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ریگستان زاب کے نواح میں ایک نہایت زرخیز ضلع ہے وہاں بارہ سو سپاہیوں کی فوج بھیجی گئی لیکن لوگوں نے ان کو شکست دے دی تب پتہ چلا کہ بغاوت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اور اس کا سرغنہ سِدّی عبدالرحمٰن ہے جس کا واحد مقصد فرانسیسیوں کا قلع قمع کرنا ہے..... ذوالقصٰی کے محاصرے میں (جو ایک عرب شہر ہے) یہ ثابت ہو گیا کہ لوگوں کی نہ تو ہمت پست ہوئی ہے نہ ان میں حملہ آوروں کی جانب کوئی رغبت پیدا ہوئی۔ یہ شہر ۵۱ دن تک حملہ آوروں کا مقابلہ کرتا رہا۔

'فرانسیسی اخبارات اور سرکاری اعلانات الجزائر میں امن وخوشحالی کی خوشخبری سناتے نہیں تھکتے لیکن ملک آج بھی اتنا ہی بے چین اور ناآسودہ ہے جتنا ابتدا میں تھا۔ فرانسیسی حاکمیت بالکل سُراب ہے، سوائے ساحلی

شہروں کے۔ قبیلے ہنوز اپنی آزادی اور خودمختاری پر اصرار کر رہے ہیں اور فرانسیسی حکومت سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ الجزائر پر اب بھی آہنی ڈنڈے سے حکومت کی جارہی ہے اور بار بار کی بغاوتوں اور شورشوں سے پتہ چلتا ہے کہ فرانسیسی غلبہ نہایت ناپائیدار ہے اور امن کے دعوے سراسر مکاری ہیں'۔ [۲۰]

وسطی ایشیا

وسطی ایشیا یعنی ترکستان جس نے قرونِ اولیٰ میں شیخ بوعلی سینا اور خوارزمی کے سے مفکر، امام بخاری اور امام ترمذی کے سے محدّث، نظامی گنجوی اور رودکی کے سے شاعر اور تیمور اور بابر کے سے حکمران پیدا کیے تھے تاتاریوں کے حملوں سے پھر کبھی جانبر نہ ہوسکا۔ ۱۷ویں صدی کے اواخر میں یہ علاقہ بخارا، خیوا، قوقند اور ترکمانیہ چار ریاستوں میں تقسیم ہوگیا تھا اور ان کے اندر بھی چھوٹے چھوٹے خودمختار امیر من مانی کرتے رہتے تھے۔ وہاں کوئی مرکزی طاقت ایسی نہ تھی جو ان کی باہمی رقابتوں اور لڑائی جھگڑوں کا تصفیہ کرسکتی۔ چنانچہ دریائے سیہون وجیون کا وہ خطہ جو کسی زمانے میں انتہائی خوش حال، زرخیز اور مردم خیز تھا ۱۸ویں، ۱۹ویں صدی میں فیوڈل ظلم وتشدد، ملّائیت اور توہم پرستی اور نکبت وافلاس کی عبرت ناک مثال پیش کرتا تھا۔

لیکن اینگلز کے بقول: 'جب نپولین نے ۱۸۱۲ء میں اپنے نقشے میں ماسکو کو ہندوستان پر چڑھائی شروع کرنے کا مرکز منتخب کیا تو یورپی طاقتوں کی نظر میں وسطی ایشیا سیاسی اور عسکری اعتبار سے نئی اہمیت اختیار کرگیا۔ ہرچند کہ نپولین اپنے ہوائی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہا لیکن یہ بات شاہانِ روس کی سمجھ میں آگئی'۔ [۲۱]

۱۸۳۹ء میں جنرل پروسکی کی کمان میں پہلی مہم خیوا روانہ کی گئی۔ امیر نے لڑے بغیر اطاعت قبول کرلی اور ایک معاہدے پر دستخط کردیئے جس کی رو سے روسی فوجوں کو خیوا کے علاقے میں رہ کر خانہ بدوش کرغزیوں کی سرکوبی کی اجازت مل گئی۔ 'مگر ڈیڑھ سال بھی نہ گزرے تھے کہ انجینئروں اور مساحت دانوں کے جتھے کے جتھے خیوا میں وارد ہونے لگے اور فوج کے سائے میں رہ کر سرِ دریا اور جھیل ارال کے شمال کے علاقے کا باقاعدہ سروے کرنے لگے۔ سڑکیں بنائی گئیں،

کنوئیں کھودے گئے اور قلعے تعمیر کیے گئے ارلاسک کا قلعہ جو سرِ دریا کے بالائی حصے میں ۴۵ میل اوپر تعمیر ہوا روسی آبادکاروں کی وسیع و عریض زرعی بستی کا مرکز بن گیا۔ جو سرِ دریا کے زیریں حصے اور ارال جھیل کے ساحلوں تک پھیلی ہوئی تھی اور تب روس نے جھیل کے شمال اور سرِ دریا کے ڈیلٹا کے پورے علاقے پر باقاعدہ طور سے قبضہ کرلیا'۔[۴۲]

اور جب کریمیا کی جنگ چھڑی تو زار روس کو موقع ہاتھ آ گیا اور جنرل پروسکی نے ۱۷ ہزار سپاہیوں کے ساتھ خیوا پر حملہ کر دیا۔ 'خان نے فوراً صلح کر لی اور خیوا پر روس کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرلیا۔ خیوا میں ایک روسی قونصل مامور ہوا جس کو خیوا کے تمام سیاسی امور کی نگرانی کا اختیار حاصل تھا'۔ یہ وہی حکمتِ عملی تھی جس کے مطابق انگریزوں نے ہندوستان کی دیسی ریاستوں کو اپنے تابع کیا تھا۔ خیوا کی روسی سلطنت میں شمولیت بخارا اور قوقند کی امارتوں کی تسخیر کی تمہید تھی۔ اینگلز لکھتا ہے کہ:

> 'خیوا کی اطاعت سے (۱۸۵۸ء) پورے توران کی تسخیر یقینی ہوگئی ہے بلکہ حقیقت بن چکی ہے۔ بخارا کے امیر نصر اللہ خان اور قوقند خان نے بھی سینٹ پیٹرس برگ (روس کا پرانا دارالسلطنت) کو اپنے سفیر بھیج دیئے ہیں ان کے ساتھ جو معاہدے ہوئے ہیں وہ اگرچہ شائع نہیں کیے گئے ہیں لیکن ان کی نوعیت کے بارے میں قیاس کرنا چنداں دشوار نہیں۔ روس ان کو جتنی آزادی دینا گوارا کرے گا وہ برائے نام ہوگی'۔

سلطنت کی اس توسیع سے فقط آمو دریا اور سرِ دریا کی زرخیز وادیوں کی فاضل پیداوار ہی زار شاہی کے تصرف میں نہیں آئی بلکہ اس کے فوجی مقاصد کے لیے بھی راہ ہموار ہوئی۔ 'فوجی نقطۂ نظر سے ان قبضوں کی بڑی قدر و قیمت ہے کیونکہ ہندوستان پر حملے کی صورت میں یہ علاقہ مرکزی کردار ادا کرے گا۔ روسیوں کی ایشیا کے وسط میں اس پیش قدمی کے بعد شمال کی جانب سے ہندوستان پر حملہ مبہم قیاس آرائی کی حدود سے نکل کر اب ایک واضح شکل اختیار کر گیا ہے...... ہندوستان پر کبھی حملہ ہوگا یا نہیں اس کا انحصار سیاسی حالات پر ہے جن کے بارے میں قیاس آرائی بہت قبل از وقت ہے'۔[۴۳]

۱۸۶۵ء میں تاشقند کو ترکستان کے روسی گورنر جنرل کا صدر مقام بنا دیا گیا۔ ۱۸۶۸ء میں بخارا

کی امارت اور ۱۸۷۳ء میں خیوا کی امارت کی حیثیت روس کی محروسہ ریاستوں کی ہوگئی۔ اس کے بعد ۱۸۷۶ء میں قوقند (فرغانہ) پر اور ۱۸۸۱ء میں ترکمانیہ (مرو) پر بھی قبضہ کرلیا گیا لیکن زار شاہی نے فیوڈل امارتوں کے بارے میں وہی پالیسی اختیار کی جس پر ہندوستانی ریاستوں میں انگریز کارفرما تھے۔ یعنی وسطی ایشیا کے فیوڈل ڈھانچے کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا اور وہاں کے امیروں اور خانوں کو اپنی مسلم رعایا کے جان و مال پر بدستور مکمل اختیار حاصل رہا۔

اس کے باوجود نوآبادیاتی استحصال کے نتیجے میں اس علاقے کے اقتصادی حالات میں رفتہ رفتہ تبدیلیاں ہونے لگیں۔ کپاس کی پیداوار جو روس کی سوتی صنعت کے تصرف میں آئی بہت بڑھ گئی۔ ریلوے لائنوں کی تعمیر سے ترکستان کے شہر آپس میں مل گئے اور زرعی پیداوار کی نقل و حرکت آسان ہوگئی۔ علاقے پر چند جننگ فیکٹریاں بھی لگیں اور کوئلہ، تیل اور لوہے کی کانوں کی تلاش بھی شروع ہوگئی۔ پھر بھی ترکستان میں صنعتی مزدوروں کی تعداد کبھی ساٹھ ہزار سے زیادہ نہ ہوئی۔ ان میں پچاس فیصد روسی بھی شامل تھے جو معاش کی تلاش میں وہاں جاکر بس گئے تھے۔ اس وقت ترکستان کی کُل آبادی پچاس لاکھ تھی۔

مگر جیسا کہ مارکس نے ہندوستان کے بارے میں کہا تھا وسطی ایشیا میں بھی ریلوے لائن سے جو نوآبادیاتی مقاصد کے لیے تعمیر کی گئی تھیں نوآبادیاتی نظام کی نفی کے پہلو نکل آئے۔ ماسکو، سینٹ پیٹرس برگ اور باکو سے رابطہ قائم ہونے کی وجہ سے تاشقند، مرو، بخارا اور خیوا وغیرہ ترقی پسند خیالات سے آشنا ہونے لگے۔ روس کے جمہوریت پسندوں، آزاد خیال دانشوروں اور سوشلسٹوں کو جب جلاوطن کرکے ترکستان میں رہنے پر مجبور کیا گیا تو مقامی تعلیم یافتہ افراد کا ان کے خیالات سے متاثر ہونا قدرتی بات تھی۔ وہاں روایتی مدرسوں کے پہلو بہ پہلو دو سو کے قریب جدید طرز کے اسکول بھی قائم ہوئے جو نوجوان ان اسکولوں سے تعلیم پاکر نکلے ان کی بدولت ترکستان کے عام لوگوں میں بھی سیاسی شعور اور اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا اور ۱۹ویں صدی کے اواخر تک ازبکوں، تاجیکوں اور ترکمانوں میں شاعروں اور ادیبوں کی اچھی خاصی تعداد ہوگئی جو زار، امیروں اور ملاؤں کے ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرنے لگے۔ ان میں مقیمی، فرقت، تاجک مورخ احمد دانش، حمزہ حکیم زادہ نیازی، ذکی بُسانی، سعیدی جلیلی ترکمانی، آواز خوارزمی، آزربائیجان کے مشہور ناولسٹ اور طنز نگار محمد سعید آردبادی، مشہور فکاہی رسالہ ملّا نصرالدین کے ایڈیٹر جلیل محمد قلی

زادہ قابلِ ذکر ہیں۔ چنانچہ آواز خوارزمی اپنی ایک طنزیہ نظم میں جس کا عنوان 'شکریہ' ہے زار، امیر اور ملاّ کے اتحاد ثلاثہ کی مذمت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

آپ کی عنایت کہ لوگ توہم پرستیوں میں مبتلا ہیں
آپ کی عنایت کہ لوگ نہ جانے کب سے ظلم اور افلاس کا شکار ہیں
آپ کی عنایت اے مفتیو اور قاضیو!
کہ پوری قوم سُور کی مانند باڑوں میں رہتی ہے۔
آپ کی عنایت کہ لوگ اپنے وطن میں بھی اجنبی ہیں
آپ کی عنایت کہ آپ نے ان کو جاہل رکھا اور
ان کی قوتِ ارادی ان سے چھین لی۔
مگر ایک دن آئے گا جب خالقِ حقیقی تم کو
طلب کرے گا اور کہے گا کہ
آپ کی عنایت کے آپ نے میری مخلوق کو یوں ذلیل و خوار کیا۔
تم جو نقدی اور خطابات کے پیچھے بھاگتے رہتے ہو
مگر تمہاری عنایت سے لوگوں کو قلم اور کاغذ تک میسر نہیں۔
بولو! کیا ہم انسان نہیں ہیں؟
کیا ہم کو کتابوں اور گیت گانوں سے پیار نہیں؟
پھر بھی تمہاری عنایت سے ہم جنگلی جانوروں کی سی زندگی گزارتے ہیں
لیکن ایک دن لوگ جاگ اٹھیں گے اور تم سے اس دنیا کا حساب چکائیں گے
جو تمہاری عنایتوں سے ویرانہ بن گئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ وی لٹسکی، Modern History of Arab Countries (ماسکو، ۱۹٦۷ء)، ص ۱۵۲

۲۔ مارکس اور اینگلز، Collected Works، جلد ۱۲ (ماسکو، ۱۹۷۹ء)، ص ۵

۳۔ ایضاً، جلد ۱۳ (ماسکو، ۱۹۸۰ء)، ص ۱۰۸

۴۔ ایضاً، جلد ۱۲، بحوالہ سابقہ، ص ص ۱۴۔۱۳

۵۔ ایضاً، جلد ۱۴ (ماسکو، ۱۹۸۰ء) ص ص ٦۸۔۳٦۷

٦۔ ایضاً، ص ٦۲۳

۷۔ ایضاً، ص ٦۱۳

۸۔ ایضاً، جلد ۱۲، بحوالہ سابقہ، ص ۳۴

۹۔ ایضاً، جلد ۱۴، بحوالہ سابقہ، ص ۲۷۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۸۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۱۴۔ ایضاً، ص ۸۹

۱۵۔ خالدہ ادیب خانم، Conflict of East and West in Turkey (دہلی، ۱۹۳۵ء)

۱٦۔ حنیف رامے (مرتب)، 'اسلامی سوشلزم' (لاہور، سن ندارد)، ص ۲۱

۱۷۔ مارکس اور اینگلز، Collected Works، جلد ۱۸ (ماسکو، ۱۹۸۲ء)، ص ۴۴

۱۸۔ ایضاً، ص ص ۴۸۔۴۰

۱۹۔ مارکس اور اینگلز، On Colonialism، بحوالہ سابقہ، ص ۹۱

۲۰۔ مارکس اور اینگلز، Collected Works، جلد ۱۸، بحوالہ سابقہ، ص ص ٦۹۔٦۷

۲۱۔ ایضاً، جلد ۱۷، ص ص ٦۰۔۵۹

۲۲۔ ایضاً، ص ٦۲

۲۳۔ ایضاً، ص ٦۸

پانچواں باب

لینن اور اقوامِ مشرق

محکوم ملکوں اور قوموں کا حقِ خود اختیاری مارکسزم کا اہم جُز ہے چنانچہ مارکس اور اینگلز نے سرمایہ داری نظام کا تجزیہ کرتے ہوئے ترکی، افغانستان، ایران، ہندوستان، چین اور انڈونیشیا وغیرہ میں مغربی طاقتوں کی استحصالی سرگرمیوں پر کڑی نکتہ چینی کی تھی اور نوآبادیاتی نظام کے بغور مطالعے سے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مغربی ملکوں کے محنت کشوں کی طبقاتی جدوجہد کی کامیابی کا انحصار مشرق کے محکوم ملکوں کی آزادی پر ہے۔

مگر پہلی انٹرنیشنل (مزدوروں کی پہلی بین الاقوامی تنظیم جس کے روحِ رواں مارکس اور اینگلز تھے) کے دور میں (۱۸۶۴ء۔۱۸۷۶ء) یورپ کی مزدور تحریک اور مشرقی ملکوں کی آزادی کی جدوجہد کے درمیان رابطے کے مواقع پیدا نہ ہوسکے اور نہ پہلی انٹرنیشنل نے مقبوضاتی نظام سے متعلق کوئی واضح رویہ اختیار کیا۔ یہ انقلابی فریضہ لینن نے ادا کیا۔

لینن (۱۸۷۰ء۔۱۹۲۴ء) کی تعلیمات کو سامراجی دور کی مارکسزم سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ لینن نے سامراجی نظام کی (جو سرمایہ داری نظام کی آخری شکل ہے) نہ صرف تشریح کی بلکہ یورپ کے محنت کشوں کی انقلابی جدوجہد اور مشرق کی محکوم اقوام کی آزادی کی تحریک دونوں کی حکمتِ عملی کے اصول مارکسی نصب العین کی روشنی میں مرتب کیے۔

لینن ایک کھاتے پیتے روسی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ اور ماں دونوں سمبرسک میں جو دریائے وولگا کے کنارے تاتاری علاقے کا شہر تھا اسکول میں پڑھاتے تھے۔ اس کی ماں فرانسیسی، جرمن اور انگریزی سے بھی بخوبی واقف تھی، عالمی ادب کا شوق رکھتی تھی اور اپنے بچوں کو بڑے شوق سے پڑھاتی تھی۔ لینن کا بچپن اسی خوشگوار ماحول میں گذرا۔ اس کو محکوم قوموں بالخصوص

مسلم قوموں سے جو فطری ہمدردی تھی کیا عجب کہ اس کا باعث بچپن کا تاتاری ماحول ہو۔ وہ سم برسک ہی میں زیرِ تعلیم تھا کہ اس کے بڑے بھائی کو زارِ روس کو قتل کرنے کی ناکام سازش کے جرم میں پھانسی دے دی گئی۔ اس حادثے کا لینن پر اور اس کے والدین پر گہرا اثر ہوا اور انہوں نے قریب کے ایک شہر سامرہ میں سکونت اختیار کرلی اور لینن نے قازان یونیورسٹی میں قانون کے شعبے میں داخلہ لے لیا۔ تب لینن نے طلبا کی تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا مگر جلد ہی پکڑ لیا گیا اور کُش کینو نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہاں ایک پولیس افسر نے پوچھ گچھ کے دوران جب لینن سے ازراہِ ہمدردی کہا کہ میاں لڑکے تم دیوار سے سر کیوں پھوڑنا چاہتے ہو تو لینن نے جواب دیا کہ 'ہاں دیوار تو ہے لیکن گلی سڑی۔ ایک ٹھوکر لگی تو گر جائے گی'۔

لینن، مارکس اور اینگلز کی تصنیفات سے اسی نظر بندی کے زمانے میں روشناس ہوا۔ رہائی کے بعد وہ قازان واپس گیا اور وہاں سوشل ڈیموکریٹوں کے ایک خفیہ گروہ میں شامل ہو گیا۔ سامرہ جا کر اس نے ایسا ہی ایک حلقہ وہاں بھی قائم کیا اور گھر بیٹھے وکالت کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ ۱۸۹۱ء میں اس کو سینٹ پیٹرس برگ (لینن گراڈ) سے قانون کی ڈگری مل گئی۔ ۱۸۹۳ء میں وہ سینٹ پیٹرس برگ چلا آیا اور مقامی سوشلسٹوں کے ساتھ مل کر طالب علموں اور مزدوروں کو مارکسزم کی تعلیم دینے لگا۔ ۱۸۹۵ء میں اس نے سوشلسٹوں کے مختلف گروہوں کو متحد کر کے 'محنت کشوں کی جدوجہدِ آزادی لیگ' کی بنیاد رکھی لیکن جلد ہی گرفتار کر لیا گیا اور سائبیریا جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۹۰۰ء میں سائبیریا سے واپس آنے کے بعد جب لینن اس نتیجے پر پہنچا کہ زارشاہی جبر و تشدد کی وجہ سے روس میں رہ کر سیاسی کام کرنا ممکن نہیں لہٰذا اس نے وطن کو خیرباد کہا اور پھر یورپ کی راہ لی۔ سترہ برس تک جلاوطنی کی زندگی گزارتا رہا کبھی جنیوا میں، کبھی لندن میں، کبھی پیرس، سٹٹ گارٹ اور میونخ میں۔ یورپ پہنچ کر وہ روسی سوشل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی میں شامل ہو گیا اور جنیوا سے اخبار 'اِسکرا' (چنگاری) جاری کیا۔ 'اِسکرا' پہلا مارکسی اخبار تھا جو روسی زبان میں شائع ہوا۔ روس میں تقریر اور تحریر کی آزادی سرے سے مفقود تھی چنانچہ 'اِسکرا' کی کاپیاں خفیہ طور پر تقسیم ہوتی تھیں۔ اس اخبار نے روسی سلطنت کے بکھرے ہوئے انقلابی حلقوں کو متحد اور منظم کرنے میں اور ان کو مارکسی اصولوں سے روشناس کرنے میں بڑا تاریخی کردار ادا کیا۔ 'اِسکرا' ہی کی تشہیر کے لیے باکو، کشنوف اور کئی دوسرے مقامات پر خفیہ چھاپے خانے قائم کیے گئے جو 'اِسکرا' کو

دوبارہ چھاپ کر مزدوروں میں تقسیم کرتے تھے۔لینن کے ہم نواؤں کا ایک حلقہ تبریز (ایران) میں بھی تھا جس کا تعلق باکو کے تیل کے کارخانوں میں کام کرنے والے آذر بائیجانی مزدوروں سے تھا اسی کے ذریعے اِسکرا اور دوسرا مارکسی لٹریچر تبریز سے باکو جاتا تھا چنانچہ لینن ایک خط میں باکو کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے نگراں L.Y.Galperin کو جون ۱۹۰۱ء میں میونخ (جرمنی) سے لکھتا ہے کہ:

'ایران کو وئینا کی راہ سے ابھی حال ہی میں ایک پارسل بھیجا جاچکا ہے لٰہذا ابھی سے ناکامی کی بات کرنا قبل از وقت ہے۔ ممکن ہے کامیاب ہو جائے۔ تبریز میں مکتوب اِلیہ کو مطلع کردو کہ ان کے پاس کتابیں برلن سے پہنچ جائیں گی۔ان کی رسید سے ہم کو اطلاع دیں'۔[1]

دوسری انٹرنیشنل

یہ زمانہ دوسری انٹرنیشنل (۱۸۸۹ء-۱۹۱۴ء) کا تھا جس میں روسی سوشل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی کے علاوہ جرمنی، ہالینڈ، فرانس، برطانیہ اور پولینڈ وغیرہ کی سوشلسٹ تنظیمیں بھی شامل تھیں۔مگر یہی زمانہ امپریلزم (سامراج) کے فروغ کا بھی تھا اور سامراجی طاقتیں قریب قریب پورے ایشیا اور افریقہ کو آپس میں بانٹ لینے میں کامیاب ہوچکی تھیں۔مغربی طاقتوں کی اس لوٹ مار پر تبصرہ کرتے ہوئے لینن نے لکھا تھا کہ:

'سرمایہ اب عالمی اور اجارہ دار ہوگیا ہے۔ مٹھی بھر بڑی طاقتوں نے دنیا کے حصے بخرے کرلیے ہیں۔ یورپ کی چار بڑی طاقتیں___ برطانیہ، فرانس، روس اور جرمنی نے جن کی مجموعی آبادی ۲۵-۳۰ کروڑ ہے اور رقبہ ۷۰ لاکھ مربع کلومیٹر ہے___ نوآبادیات پر جن کی آبادی ۵۰ کروڑ ہے اور جن کا رقبہ ساڑھے ۶ کروڑ مربع کلومیٹر ہے قابض ہیں۔گویا آدھے کرۂ ارض پر۔ان میں ایشیا کی تین ریاستوں___ چین، ترکی اور ایران کو بھی شامل کرلو جن کو وہ ٹھگ یعنی جاپان، روس، برطانیہ اور فرانس جو ''آزادی'' کی جنگ لڑ رہے ہیں تھوڑا تھوڑا کرکے ہضم کررہے ہیں۔یہ

تینوں ایشیائی ریاستیں نیم آزاد ریاستیں کہلائی جانے کی مستحق ہیں (درحقیقت یہ اب ۹۰ فیصد مقبوضہ ہیں) ان کی مجموعی آبادی ۳۶۱ کروڑ ہے اور رقبہ ڈیڑھ کروڑ مربع کلومیٹر ہے (پورے یورپ کے رقبے سے تقریباً ڈیڑھ گنا زیادہ)۔

'اس کے علاوہ برطانیہ فرانس اور جرمنی نے اب تک ۷۰/ارب روبل کے لگ بھگ باہر سرمایہ لگا رکھا ہے۔ اس رقم سے ان کو ہر سال ۳/ارب روبل سے زیادہ "جائز" نفع حاصل ہوتا ہے اور اس کو حاصل کرنے کا فریضہ کروڑپتیوں کی قومی کمیٹیاں جن کو حکومت کہتے ہیں سرانجام دیتی ہیں۔ ان کے پاس فوجیں ہیں، جنگی بیڑے ہیں اور جو کروڑپتیوں کے بیٹوں بھائیوں کو نوآبادیات اور نیم نوآبادیات میں نوکریاں مہیا کرتی ہیں۔ بطور وائسرائے، قونصل، سفیر، ہر قسم کے اعلیٰ افسر، پادری اور دوسری جونکیں۔

'یہ ہے وہ طریقہ جس کے مطابق دنیا کی ایک ارب کے قریب آبادی کو مٹھی بھر بڑی طاقتیں سرمایہ داری نظام کے عہدِ عروج میں لوٹتی ہیں'۔[۲]

لینن نے امریکی مقبوضات کا ذکر نہیں کیا حالانکہ ۱۹۰۱ء میں امریکہ نے اسپین سے جنگ کر کے جزائر فلپین اور کیوبا پر قبضہ کر لیا تھا جن کا مجموعی رقبہ ۲ لاکھ کلومیٹر اور آبادی پونے چار کروڑ تھی۔

مقبوضات پر سیاسی تسلط اور ان کے مال و ذخائر پر بلا شرکتِ غیرے تصرّف سے سامراجی نظام خوب پھولا پھلا۔ درآمد برآمد کی مکمل اجارہ داری، سرمائے کا چند صنعت کاروں کے ہاتھوں میں ارتکاز، بینکوں کے ذریعے مالیاتی سرمائے کی توسیع، پس ماندہ ملکوں میں سرمایہ لگا کر منافع کی شرح بڑھانے کے مواقع غرضیکہ کوئی ایسا حربہ نہ تھا جس کو سامراجی طاقتوں نے بے دردی سے استعمال نہ کیا ہو۔ اسی لوٹ مار کا ردِعمل تھا جو ۲۰ ویں صدی کے اوائل میں ترکی، ایران، چین، مصر، ہندوستان، ہر جگہ شدید احتجاج کی شکل میں ظاہر ہوا اور آزادی کی جدوجہد ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔ ان حالات کے پیشِ نظر دوسری انٹرنیشنل کے لیے بھی نوآبادیاتی نظام سے متعلق کوئی

نہ کوئی پالیسی اختیار کرنا ناگزیر ہو گیا۔ اسی اثناء میں جنوبی افریقہ کے ولندیزی نژاد آبادکاروں اور نووارد انگریزوں میں جنگ چھڑ گئی (۱۸۹۹ء۔۱۹۰۲ء)۔ ولندیزی وہاں مدت سے آباد تھے۔ انہوں نے مقامی باشندوں کو زمینوں سے بے دخل کر دیا تھا اور ان سے غلاموں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ ۱۸۸٦ء میں وہاں سونے کی کانیں دریافت ہوئیں تو انگریز سرمایہ کاروں کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ بوئروں نے مزاحمت کی تو برطانیہ نے جنوبی افریقہ میں فوجیں اتار دیں۔ گھمسان کا رن پڑا مگر آخر کار بوئر ہار گئے اور جنوبی افریقہ سلطنتِ برطانیہ میں شامل کر لیا گیا۔

دوسری انٹرنیشنل نے ۱۹۰۰ء میں اپنے سالانہ اجلاس میں اس برطانوی حملے کی شدید مذمت کی لیکن اس تنظیم میں ایسے عناصر بھی تھے جن کا خیال تھا کہ مشرق کی غیر مہذب اور وحشی قوموں کو سامراجی طاقتوں ہی کے ذریعے تہذیب سکھائی جا سکتی ہے اور یہ پس ماندہ لوگ انہیں کے سائے میں رہ کر ترقی کر سکتے ہیں۔ یہ رجحان نتیجہ تھا دولت کی اس ریل پیل کا جو مقبوضات کے استحصال سے حاصل ہوتی تھی۔ اینگلز نے اسی بنا پر انگریز مزدوروں کی سیاسی کم فہمی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا تھا کہ مقبوضات سے مفت ہاتھ آئی ہوئی دولت کے دسترخوان سے مزدوروں کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ انقلابی انداز میں سوچنے سے قاصر ہیں۔

لینن نے اس غیر انقلابی رجحان کی شدت سے مخالفت کی۔ اس نے اخبار 'اِسکرا' کے پہلے شمارے ہی میں (دسمبر ۱۹۰۰ء) حاکم اور محکوم قوموں کے رشتے کی اصل حقیقت کھول کر بیان کر دی۔ ان دنوں زار روس کی حکومت نے چین پر حملہ کر دیا تھا۔ لینن نے اس سامراجی جارحیت پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ:

> 'روسی حکومت اور اس کا فرماں بردار پریس ''چینی بربریت'' پر ''یورپی تہذیب'' کی فتح کا جشن منا رہی ہے اور مشرقِ بعید میں روس کے ''تہذیبی مشن'' کی کامیابی پر نازاں ہے...... مگر آئیے دیکھیں اس جنگ کے بارے میں سوشلسٹوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ یہ جنگ کس کے مفاد میں لڑی جا رہی ہے؟ روسی حکومت کی موجودہ پالیسی کی اصل نوعیت کیا ہے؟
> 'ہماری حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہ چین کے خلاف نہیں لڑ رہی ہے بلکہ بغاوت فرو کرنے میں کوشاں ہے اور قانون اور امن کی بحالی میں چین کی

قانونی حکومت کی مدد کر رہی ہے..... مگر چینیوں نے یورپیوں پر حملہ کیوں کیا، بغاوت کیوں ہوئی کہ انگریز، فرانسیسی، جرمن، روسی، جاپانی سب اس بغاوت کو کچلنے میں پیش پیش ہیں۔ اس کے جواب میں جنگ کے حمایتی جواب دیتے ہیں کہ ''زرد قوم کی سفید قوم سے نفرت''، ''یورپی تہذیب وتمدن سے چینیوں کی نفرت'' ہاں یہ بالکل درست ہے کہ چین کے لوگ یورپیوں سے نفرت کرتے ہیں لیکن وہ کون سے یورپین ہیں جن سے وہ متنفر ہیں، اور کیوں؟ چینی لوگ یورپین عوام سے نفرت نہیں کرتے۔ ان کا ان سے کوئی جھگڑا کبھی نہیں ہوا۔ وہ یورپی سرمایہ داروں سے اور سرمایہ داروں کی فرمانبردار یورپین حکومتوں سے نفرت کرتے ہیں۔ چینی ان افراد سے نفرت کیوں نہ کریں جو فقط فائدہ حاصل کرنے چین گئے ہیں، جنہوں نے اپنے نام نہاد تمدن کو دغابازی، لوٹ اور تشدد کی غرض سے استعمال کیا ہے، جنہوں نے چین سے جنگ اس غرض سے چھیڑی ہے کہ افیون کی تجارت کا حق حاصل کریں اور چینیوں کو افیونی بنادیں (برطانیہ اور فرانس کا ۱۸۵۶ء میں چین پر حملہ) اور جنہوں نے پوری منافقت سے عیسائی مذہب کی تبلیغ کی آڑ میں لوٹ کھسوٹ کی پالیسی پر عمل کیا ہے۔ یورپ کی بورژوا حکومتیں چین میں مدت سے اس لوٹ کی پالیسی پر کاربند ہیں اور اب روس کی مشتبہ حکومت بھی ان میں شامل ہوگئی ہے۔ لوٹ کی اس پالیسی کو عموماً نوآبادیاتی پالیسی کہا جاتا ہے۔ جس ملک میں بھی سرمایہ دارانہ صنعت تیزی سے بڑھتی ہے اس کو بہت جلد نوآبادیاں تلاش کرنی پڑتی ہیں یعنی وہ ملک جن میں صنعت بہت کم ہے۔ جن میں بڑی حد تک Patriarchal طریقہ زندگی رائج ہے اور جو مصنوعات کے لیے بازار اور اونچے نفع کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ مٹھی بھر سرمایہ داروں کے منافع کی خاطر بورژوا حکومتوں نے بے شمار جنگیں کی ہیں، غیر صحت مند گرم علاقوں میں فوجی دستے بھیجے ہیں مرنے کے لیے،

عوام کی جیب سے نکال کر کروڑوں روپے پانی کی طرح بہایا ہے اور نوآبادیات کے لوگوں کو بغاوت کرنے پر یا فاقے سے مرنے پر مجبور کیا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف لوگوں کی بغاوت ہی کی یاد کافی ہے اور جو وہاں قحط پڑا اور اس جنگ کے بارے میں سوچیں جو انگریز بوئروں سے لڑ رہے ہیں۔

'سچ پوچھو تو یورپی حکومتوں نے (جن میں روسی حکومت پیش پیش ہے) چین کا بٹوارہ شروع کر دیا ہے لیکن چپکے چپکے چوروں کی طرح'' ان کی ان جارحانہ سرگرمیوں سے فائدہ کس کو ہوتا ہے ان مٹھی بھر بڑے سرمایہ داروں کو جو چین سے تجارت کرتے ہیں، ان مٹھی بھر صنعت کاروں کو جو ایشیائی بازاروں کے لیے مال تیار کرتے ہیں، ان مٹھی بھر کنٹریکٹروں کو جو ضروری فوجی آرڈروں سے اپنی جھولی بھرتے ہیں''......

مگر روس کے محنت کشوں کو چین پر فتوحات سے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ ہزاروں خاندان تباہ و برباد ہیں۔ ان کو روٹی فراہم کرنے والے فوج میں بھرتی کر لیے گئے ہیں۔

'لہٰذا تمام طبقاتی شعور رکھنے والے محنت کشوں کا فرض ہے کہ وہ پوری قوت سے اٹھ کھڑے ہوں ان لوگوں کے خلاف جو قومی نفرت پھیلاتے ہیں اور محنت کشوں کی توجہ اپنے اصل دشمنوں سے ہٹاتے ہیں۔ زار کی حکومت کی پالیسی چین میں مجرمانہ پالیسی ہے جس سے لوگ پہلے سے بھی زیادہ غریب ہوئے ہیں، ان کو خراب کیا جا رہا ہے اور تشدد بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔ زار کی حکومت اپنے عوام ہی کو غلام نہیں بنائے ہوئے ہے بلکہ ان سے دوسروں کو دبانے کا کام بھی لے رہی ہے جو اپنی غلامی کے خلاف بغاوت کرتے ہیں'۔[۳]

مگر سامراج پرست ذہنیت اتنی آسانی سے بدلنے والی نہ تھی۔ چنانچہ دوسری انٹرنیشنل کی ساتویں کانگرس میں جو اگست ۱۹۰۷ء میں سٹٹ گارٹ (جرمنی) کے مقام پر منعقد ہوئی تھی ایک بار

پھر یہ سوال اٹھا کہ مقبوضات کے بارے میں سوشلسٹوں کا موقف کیا ہو؟ اس کانگرس میں یورپ، ایشیا، امریکہ، آسٹریلیا اور افریقہ سے آئے ہوئے ۲۵ ملکوں کے ۸۸۴ ڈیلی گیٹ شریک تھے۔ ایشیا کی نمائندگی جاپان اور ہندوستان کے ڈیلی گیٹ کر رہے تھے اور روسی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے نمائندے لینن، لُونا چارسکی اور لٹ وی نوف تھے۔ لُونا چارسکی انقلاب کے بعد روس کی پہلی کابینہ میں وزیرِ تعلیم و تہذیب ہوا اور لِٹ وی نوف ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۹ء تک سوویت یونین کا وزیرِ خارجہ رہا۔

کانگرس میں نوآبادیات کے مسئلے پر جو مباحثہ ہوا اس کی روئیداد بیان کرتے ہوئے لینن نے لکھا کہ:

'کمیشن میں موقع پرستوں کی اکثریت ہوگئی اور یہ ننگِ انسانیت فقرہ قرارداد میں بڑھا دیا گیا کہ "کانگریس اصولی طور پر اور ہمیشہ کے لیے نوآبادیاتی پالیسی کو مسترد نہیں کرتی کیونکہ سوشلسٹ حکومت کے تحت اس پالیسی کا نتیجہ تہذیب رساں ہوسکتا ہے۔" درحقیقت یہ تجویز عبارت تھی بورژوا پالیسی کی جانب مراجعت سے اور بورژوا سوچ سے جو نوآبادیاتی جنگوں اور مظالم کو جائز سمجھتی ہے۔ چنانچہ ایک امریکی ڈیلی گیٹ نے کہا کہ یہ تو روزویلٹ سے جاملنا ہے'۔

سوشلزم نے نوآبادیات میں اصلاحات کی حمایت سے کبھی انکار نہیں کیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ فتوحات کے بارے میں اور دوسری قوموں کو مطیع کرنے اور تشدد اور لوٹ کی نوآبادیاتی پالیسی سے متعلق اپنے اصول اور موقف کو کمزور کیا جائے...... "سوشلسٹ نوآبادیاتی پالیسی" کا تصور ہی نہایت بھونڈا ہے کانگریس نے بالکل ٹھیک کیا جو اس فقرے کو قرارداد سے حذف کر دیا اور نوآبادیاتی پالیسی کی جو مذمت کی وہ سابقہ قراردادوں سے بھی زیادہ سخت تھی۔

'نوآبادیات کے سوال پر یہ رائے دہی بہت اہم ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اس نے سوشلسٹ موقع پرستی کو بے نقاب کر دیا جو بورژوا ہتھکنڈوں

سے متاثر ہو جاتی ہے۔ دو ٹمش اس قرارداد سے یورپ کی مزدور تحریک کا ایک منفی پہلو کھل کر سامنے آ گیا جو پرولتاریہ کے مفاد کو سخت نقصان پہنچا سکتا ہے لہٰذا ہم کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا...... یورپ کے پرولتاریہ کی ایک حد تک پوزیشن یہ ہے کہ اس کی محنت ہی پوری سوسائٹی کی پرورش نہیں کرتی بلکہ اس میں نوآبادیات کے محکوم عوام کی محنت بھی اس پرورش میں شامل ہے۔ مثلاً انگریز بورژوا برطانوی مزدوروں کی قوت محنت کے مقابلے میں ہندوستان اور دوسری نوآبادیوں کے باشندوں کی قوت محنت سے زیادہ نفع حاصل کرتا ہے۔ یہی صورتِ حال بعض ملکوں میں قومی تکبر (شاونیت) کی اقتصادی بنیاد ہے۔'[۵]

لیکن سامراج کے گماشتوں نے ہار نہیں مانی بلکہ برابر اس کوشش میں رہے کہ دوسری انٹرنیشنل کے سامراج دشمن رویئے کو کسی نہ کسی طرح اتنا نرم کر دیا جائے کہ مزدور طبقے میں اس مسئلے کی اہمیت باقی نہ رہے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں دوسری انٹرنیشنل کے سوشلسٹ بیوریو کا اجلاس جب برسلز میں ہوا تو دیگر امور کے علاوہ 'نوآبادیاتی اصلاحات' کا سوال پھر اٹھا۔ لینن نے بحث کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اخبار پرولتاری میں لکھا کہ:

'ڈچ ڈیلی گیٹ وان کول نے جس کو سٹٹ گارٹ کانگرس میں نوآبادیات کے سوال پر اپنی موقع پرستانہ تجویز کی بدولت شہرت ملی تھی سوشل ڈیموکریسی کے لیے ''مثبت'' نوآبادیاتی منصوبے کے دل پسند تصور کو اپنی رپورٹ میں قدرے مختلف انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس نے نوآبادیاتی پالیسی کے خلاف سوشل ڈیموکریٹوں کی جدوجہد کو بالکل نظرانداز کر دیا، عوام میں نوآبادیاتی قزاقی کے خلاف ایجی ٹیشن سے اور نوآبادیات میں مظلوم عوام میں جو مقاومت اور مخالفت کی روح بیدار ہو رہی ہے اس سے یکسر چشم پوشی اختیار کر لی اور اپنی پوری توجہ موجودہ نظام میں رہتے ہوئے نوآبادیات میں حالات کے ممکنہ اصلاحات کی فہرست پر مرکوز کر دی۔ ایک مشفق و مہربان افسر کی مانند اس نے اپنی فہرست میں

ملکیتِ زمین، اسکول، صنعت وحرفت کی حوصلہ افزائی، جیل کی اصلاحات سب کا ذکر کیا اور برابر اس بات پر زور دیتا رہا کہ حتی الوسع ''پریکٹیکل'' ہونا چاہیے مثلاً یہ کہ رائے دہی کا حق غیر مہذب وحشیوں پر ہمیشہ لاگو نہیں ہوسکتا یا یہ کہ نوآبادیات میں جبری بیگار کا رواج وقت کی ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرضیکہ پوری رپورٹ اسی جذبے کی غماز تھی۔ پرولتاریہ کے طبقاتی جدوجہد کی سوچ سے خالی انتہائی پیٹی بورژوا بلکہ اس سے بھی بدتر افسر شاہی انداز میں ''اصلاحات'' کی وکالت کی گئی تھی'۔

کارل کاؤتسکی نے وان کول کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ:

'وان کول کا کہنا ہے کہ چونکہ بعض مخصوص حالات میں مکمل حقِ رائے دہی نوآبادیات میں لاگو نہیں ہوسکتا لہٰذا وہ کسی نہ کسی شکل میں نوآبادیات میں مطلق العنانی اور استبداد کو قبول کرتا ہے کیونکہ وہ رائے دہی کا کوئی دوسرا طریقہ نہ پیش کرتا ہے نہ کرسکتا ہے۔ وان کول جبری بیگار کے امکانات کا قائل ہے لہٰذا وہ بورژوا پالیسی کے لیے دروازہ کھولتا ہے جو ہزاروں انسانوں کو کسی نہ کسی بہانے نوآبادیات میں غلامی پر مجبور کرتی ہے۔

'یہ دیکھ کر کہ اس کی تجویز کا جنازہ نکل جائے گا وان کول نے اپنی تجویز واپس لے لی'۔[۲]

یہ اختلافِ رائے بالآخر پہلی جنگِ عظیم کے موقع پر رنگ لایا اور دوسری انٹرنیشنل کے خاتمے کا سبب بنا کیونکہ دوسری انٹرنیشنل جو بین الاقوامی مزدور تحریک کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی تھی جنگ چھڑتے ہی جارحانہ وطن پرستی کا شکار ہوگئی۔ لینن کی بالشویک پارٹی کا موقف تھا کہ یہ سامراجی جنگ ہے جو مقبوضات اور نوآبادیات کو ازسرِ نو تقسیم کرنے کی خاطر لڑی جارہی ہے اور اس میں دنیا بھر کے محنت کشوں ہی کا جانی اور مالی زیاں ہے لہٰذا ہم کو اس جنگ کی شدت سے مخالفت کرنی چاہیے اور سامراجی جنگ کو خانہ جنگی میں بدل دینا چاہیے یعنی اپنے ملک کے سامراجی حاکموں کے خلاف جدوجہد کرکے ان کا تختہ الٹ دینا چاہیے لیکن دوسری انٹرنیشنل کے لیڈروں نے لینن کی بات نہ مانی اور بین الاقوامی سوشلزم کا لبادہ اُتار کر پھینک دیا اور محنت کشوں کو بھی جنگ کی آگ میں

جھونک دیا۔ برطانیہ اور فرانس کے محنت کش جرمنی اور آسٹریلیا کے محنت کشوں کے مقابلے میں صف آرا ہو گئے۔ مزدور تحریک کی بین الاقوامیت جارحانہ قوم پرستی کی نذر ہو گئی۔ دوسری انٹرنیشنل کا جنازہ نکل گیا۔ وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

ایشیا میں بیداری کی لہر

انسان نے زمانے کی رفتار کو ناپنے کے جو پیمانے بنا رکھے ہیں تاریخ کے نشیب و فراز ان کے پابند نہیں۔ صدیاں آتی ہیں اور خاموشی سے گزر جاتی ہیں نہ ان کا یومِ پیدائش کوئی اہمیت رکھتا ہے نہ یومِ وداع۔ ان کی آمد و رفت سے نہ زمین کی گردش تیز ہوتی ہے اور نہ موسم اور زندگی کے معمولات میں کوئی فرق آتا ہے لیکن بعض اوقات معاشرے کے ہیجان و اضطراب کی اٹھتی ہوئی لہریں کسی نئی صدی کے اوّلین لمحات سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں اور تب نئی صدی کے افق سے نئے عہد کا آفتاب بھی طلوع ہوتا ہے۔ مثلاً ۱۹ ویں صدی کی آمد آمد تھی جب انقلابِ فرانس کا غلغلہ بلند ہوا اور دنیا ایک نئے سماجی دور میں داخل ہوئی۔ اسی طرح ۲۰ ویں صدی بھی تاریخِ عالم کے لیے ایک نئے عہد کی بشارت ساتھ لائی اور اقوامِ مشرق شعور و آگہی کی ایک نئی منزل میں داخل ہوئیں۔

اس نئے عہد کا نقطۂ آغاز ۱۹۰۴ء کی روس اور جاپان کی جنگ تھی۔ یہ جنگ نتیجہ تھی اس رقابت کا جو کوریا اور منچوریا پر قبضے کی خاطر دونوں ملکوں میں عرصے سے جاری تھی۔ جنگ میں زار روس کی شکست اقوامِ مشرق کے حق میں بڑا نیک شگون ثابت ہوئی۔ مغرب کی ایک زبردست سامراجی طاقت کو جو ناقابلِ شکست سمجھی جاتی تھی پہلی بار مشرق کے ایک چھوٹے سے ملک سے زِک اٹھانی پڑی تھی۔ چنانچہ جاپان کی فتح بیداریٔ مشرق کی علامت بن گئی اور ایشیا کی محکوم قوموں پر اس کا بڑا نفسیاتی اثر ہوا۔

خود روس میں زار شاہی کی طاقت اور ہیبت کا طلسم اسی جنگ کے بعد ٹوٹا اور روس کے مظلوم عوام نے پہلی بار بڑے پیمانے پر انقلابی جدوجہد شروع کی۔ ۱۹۰۵ء کا روسی انقلاب اگرچہ ناکام ہوا مگر روس کے محنت کشوں کی مسلح جدوجہد ایشیا کی محکوم قوموں کے لیے مشعلِ راہ بن گئی۔ لینن اپنے مقالے 'بیداریٔ مشرق' میں ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

'عالمگیر سرمایہ داری اور ۱۹۰۵ء کی تحریکِ روس نے بالآخر ایشیا کو بیدار کر دیا

ہے۔لاکھوں کروڑوں اُفتادگانِ خاک اور گم کردگانِ راہ قرونِ وسطیٰ کے جمود سے جاگ اٹھے ہیں اور نئی زندگی کے آرزومندوں نے اپنے بنیادی حقوق اور جمہوریت کے لیے لڑنے پر کمر باندھ لی ہے۔ایشیا کی بیداراور یورپ کے ترقی یافتہ پرولتاریہ کے اقتدار کی جدوجہد علامت ہے تاریخِ عالم کے عہدِ نو کی جو اس صدی کی ابتدا میں شروع ہوا'۔ [۷]

روسی انقلاب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ روس کے سرحدی ملکوں ___ ایران، ترکی، کوریا اور چین ___ کے بے شمار تارکینِ وطن جو باکو، وسطی اشیا اور مشرقی روس میں محنت مزدوری کرتے تھے روسی انقلاب میں شریک ہوئے تھے۔انہوں نے بعد میں وطن جا کر انقلابی تحریکوں کی داغ بیل ڈالی۔

مشہور برطانوی مورّخ رجنی پام دَت ہندوستانیوں پر روسی انقلاب کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

'۱۹۰۵ء میں جاپان کی فتح کا ملک میں پُر جوش خیر مقدم کیا گیا اور ایک ایشیائی طاقت کی مغربی سامراج پر فتح سے اعتماد کا ایک نیا احساس بیدار ہوا۔ نتیجے کے طور پر مصر اور آئرلینڈ میں برطانوی غلبے کے خلاف جدوجہد، عثمانی سلطنت کے حصے بخرے کرنے کے مذموم منصوبے اور ایران کو تقسیم کرنے کی اینگلو روسی سازش نے ہندوستانیوں میں شدید ہمدردی کا جذبہ بیدار کیا اور روسی انقلاب، ترکی انقلاب اور چینی انقلاب کی گونج سے دل دھڑکنے لگے'۔ [۸]

سامراجی نظام کی خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے لینن نے لکھا تھا کہ سامراجی طاقتوں نے دنیا کے پس ماندہ علاقوں کو آپس میں تقسیم کرلیا ہے کیونکہ:

'اطاعت کی وہ شکل جس میں ملکوں اور قوموں کی آزادی کا زیاں ہو مالیاتی سرمائے کے حق میں نہایت موزوں اور زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور اب یہ کوشش ہو رہی ہے کہ گنتی کے جو نیم آزاد ملک بچ رہے ہیں مثلاً ترکی، ایران اور چین ان کو بھی بانٹ لیا جائے۔اس سلسلے

میں نیم آزاد ملک ''درمیانہ دور'' کی اچھی مثال ہیں۔ مالیاتی سرمائے کے
عہد میں ان نیم آزاد ملکوں کی خاطر کشمکش کا خاص طور پر تیز اور تلخ ہونا
قدرتی امر ہے کیونکہ بقیہ دنیا تو آپس میں تقسیم ہو چکی ہے'۔[۹]

مشرق کے محکوم اور نیم محکوم ملکوں میں مغرب کے مالیاتی سرمائے کا اثر ونفوذ ۱۹ویں صدی کے وسط ہی میں شروع ہو گیا تھا لیکن اس وقت تک مالیاتی سرمایہ لگانے کی غرض وغایت مغربی ملکوں کے صنعتی، تجارتی اور سیاسی مقاصد کو تقویت پہنچانا تھا مثلاً ہندوستان میں ۱۸۵۰ء اور ۱۸۶۹ء کے درمیان برطانوی کمپنیوں نے ۷ کروڑ ۶۶ لاکھ پونڈ کی لاگت سے ۴۲۵۵ میل ریلوے لائن بچھائی۔ اس سرمائے پر برطانوی حکومتِ ہند نے پانچ فیصدی سود کی ضمانت دی۔ مگر لارڈ ڈلہوزی وائسرائے ہند نے ۱۸۵۳ء میں اپنی سرکاری رپورٹ میں اس سرمایہ کاری کے چار فوائد لکھے تھے۔ (۱) برطانوی مصنوعات کے لیے بازاروں کی توسیع۔ (۲) زرعی خام مال کی برآمد میں آسانی۔ (۳) برطانوی سرمایہ کاری کے مواقع۔ (۴) فوجوں کی سرعت کے ساتھ نقل وحرکت۔ لارڈ ڈلہوزی کی رپورٹ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس وقت سرمایہ لگانے کا اصل مقصد اقتصادی اور سیاسی تھا نہ کہ سرمائے میں اضافہ کرنا۔ ریلوے کے علاوہ ۸ کروڑ پونڈ کا جو سرمایہ ہندوستان میں درآمد ہوا وہ انگریز کمپنیوں نے سرکاری قرضوں میں، بیرونی تجارت میں، پٹ سن، چاول، کافی اور ربڑ کے باغات میں، کوئلہ، لوہا اور دوسری معدنیات کی کانوں میں لگایا نہ کہ فیکٹریوں اور ملوں میں۔ سامراجی اصول یہ تھا کہ مقبوضات وغیرہ میں سرمایہ لگایا جائے تو خام مال پیدا کرنے کے شعبوں میں یا ریلوے میں یا سرکاری قرضوں میں۔ ملوں فیکٹریوں میں نہ لگایا جائے کہ وہاں کی معیشت خود کفیل ہو جائے اور سامراجی ملکوں کی مصنوعات کی درآمد متاثر ہو۔ ۱۹۰۹ء میں انگریزوں کے ہندوستان میں سرمائے کی کُل مالیت ۳۷ کروڑ پونڈ کے لگ بھگ تھی۔ اس میں ۱۸ کروڑ سرکاری قرضوں میں، ۱۴ کروڑ ریلوے میں، ڈھائی کروڑ پٹ سن اور ربڑ کے باغات میں، ۴۰ لاکھ ٹریموں میں، ۳۵ لاکھ کانوں میں، ۳۴ لاکھ بینکوں میں اور فقط ۲۵ لاکھ تجارتی اور صنعتی اداروں میں لگا تھا۔[۱۰]

مصر، ترکی اور ایران میں بھی اسی پالیسی پر عمل کیا گیا اور قرضوں کا بوجھ لاد کر اقتصادی اور سیاسی مقاصد حاصل کیے گئے۔ مثلاً تونس کے قرضے کی رقم جو ۱۸۶۲ء میں دو کروڑ اسّی لاکھ فرانک

تھی، ۱۸۶۹ء میں بڑھ کر ۱۲ کروڑ پچاس لاکھ فرانک ہوگئی۔ نتیجہ یہ تھا کہ تونس کے سالانہ بجٹ کا ۹/۱۰ حصہ قرضے کی ادائیگی پر صرف ہوتا تھا۔ بالآخر تونس دیوالیہ ہوگیا اور فرانس، اٹلی اور برطانیہ کے ایک مالی کمیشن نے تونس کے محصولات کی آمدنی اپنی تحویل میں لے لی۔[۱۱]

اسی چالبازی سے مصر پر بھی غلبہ حاصل کیا گیا۔ برطانیہ نے شاہ اسمٰعیل کو پہلا قرضہ ۱۸۶۴ء میں دیا تھا (۵۷ لاکھ پونڈ) اس کے عوض شاہ اسمٰعیل نے ڈیلٹا کے نہایت زرخیز تین ضلعوں کا مالیہ رہن رکھ دیا تھا۔ بارہ سال کے اندر قرضوں کی رقم بڑھ کر ۱۶ کروڑ پونڈ ہوگئی اور جب حکومت کا دیوالیہ نکلنے لگا تو ۱۸۷۵ء میں نہر سوئز کے حصص بھی جن کی مالیت ساڑھے تین کروڑ پونڈ تھی برطانیہ کے ہاتھ فقط ۴۰ لاکھ میں فروخت کردیئے گئے۔ لارڈ کرومر کی صدارت میں ایک قرضہ کمیشن بنا جس نے مصر کی آمدنی اور خرچ دونوں کی نگرانی شروع کردی۔ تب وزارتیں بھی قرضہ کمیشن کی مرضی سے بننے لگیں اور ۱۸۸۲ء میں مصر برطانیہ کے زیرِ نگیں آگیا۔[۱۲]

یہی حربہ ایران میں بھی آزمایا گیا۔ سلطان ناصرالدین شاہ قاچار کو روپیوں کی ضرورت ہوئی تو اس نے ۱۸۵۸ء میں ایک انگریزی ٹیلی گراف کمپنی سے رقم کے عوض کمپنی کو ملک میں ٹیلی گراف لائن بچھانے کی اجازت دے دی۔ اس طرح ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان مواصلاتی رابطہ (جس کی ۱۸۵۷ء کی بغاوتِ ہند کے دوران شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی) قائم ہوگیا۔ ٹیلی گراف لائن کی دیکھ بھال کے لیے جو چودہ مرکز کھولے گئے ان سے جاسوسی اور قبائلیوں کو رشوت دے کر رام کرنے کا کام بھی لیا گیا۔ ۱۸۷۳ء میں سلطان کو سفرِ یورپ کے لیے روپیوں کی پھر ضرورت پڑی تو رائٹر نامی ایک انگریز کو پورے ایران میں ریلوے لائن بچھانے کا ٹھیکہ دیا گیا اور کانکنی کی رعایت بھی۔ ۱۸۸۹ء میں انگریزوں نے تہران میں پہلا بینک امپیریل بینک آف پرشیا کے نام سے کھولا اور اس طرح ایرانی سرمائے ہی کے ذریعے ایران کو اپنا دستِ نگر بنانے کا انتظام کرلیا۔ سلطان نے بینک کو ملک میں شاخیں قائم کرنے اور نوٹ چھاپنے کے اختیارات بھی دے دیئے۔ یہی مراعات شمال میں روسو پرشین بینک کو بھی عطا ہوئیں۔ ۱۸۹۰ء میں لِنچ نامی ایک انگریز کو دریائے کارون پر جہازرانی کا ٹھیکہ دیا گیا۔ قالین سازی ایران کی قدیم صنعت ہے جو مقامی تاجروں کی اجارہ داری تھی۔ انگریزوں نے ایران میں جگہ جگہ اپنی فیکٹریاں قائم کرلیں اور ایرانی دستکاروں کو ملازم رکھ کر خود قالین بنانے اور برآمد کرنے لگے۔ پانی سر سے

اونچا ہوتا جارہا تھا اور ایرانیوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہوتا جارہا تھا۔

۱۸۹۰ء میں ناصرالدین شاہ نے پندرہ ہزار پونڈ سالانہ کے عوض ایک انگریز کمپنی کو ایران میں تمباکو کی کاشت اور خرید و فروخت کی اجارہ داری پچاس برس کے لیے دے دی۔ اس رعایت سے پورے ایران میں تہلکہ مچ گیا کیونکہ اس سے پیشتر جو ٹھیکے تقسیم ہوئے تھے ان سے تھوڑے لوگ متاثر ہوئے تھے۔ تمباکو کی اجارہ داری سے ایران کے شہر، دیہات بھی متاثر ہوئے چنانچہ ایرانی قوم ایک دم چیخ اٹھی۔ ایرانی مجتہدوں نے فتویٰ دے دیا کہ تمباکو پینا، تمباکو کاشت کرنا اور اس کی خرید و فروخت سب حرام ہے۔

لوگوں نے حقہ پینا ترک کر دیا، یہاں تک کہ جب سلطان نے فتوے کے دوسرے دن حقہ طلب کیا تو شاہی ملازموں نے حقے کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔ آخر اس ملک گیر مقاطعہ سے مجبور ہو کر سلطان نے اجارہ داری کا معاہدہ منسوخ کر دیا۔ مطلق العنان شہنشاہی کی یہ پہلی شکست تھی۔ لیکن اب سوال پانچ لاکھ پونڈ کی واپسی کا تھا جو سلطان نے کھا پی کر اڑا دیئے تھے۔ ناچار یہ رقم امپیریل بینک سے چھ فیصد سود پر قرض لی گئی اور سود کی سال بہ سال ادائیگی کے لیے خلیج فارس کی بندرگاہوں 'بوشہر اور خرم شہر' کی محصولات کی وصولی انگریزوں کے ہاتھ رہن رکھ دی گئی۔

سلطان کے خلاف نفرت اور بڑھتی ہی جاتی تھی۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں سلطان کی پچاس سالہ جوبلی سے چند روز پیشتر سیّد جمال الدین افغانی کے ایک شاگرد مرزا محمد رضا کرمانی نے ناصرالدین شاہ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

مگر اس کے بیٹے مظفرالدین شاہ نے باپ کے انجام سے کچھ نہ سیکھا۔ ناصرالدین شاہ نے یورپ کے تین سفر کیے تھے اور لاکھوں پونڈ عیاشیوں میں اُڑائے تھے۔ مظفرالدین کیوں پیچھے رہتا۔ ۱۸۹۸ء میں سفر کی تیاریاں شروع ہوئیں تو دس لاکھ پونڈ جو آج کے حساب سے کئی کروڑ بنیں گے بیلجیئم کے تین ساہوکاروں سے قرض لیے گئے اور کرمان شاہ کی راہ سے درآمد برآمد ہونے والے مال کے محصولات ان کے ہاتھ رہن رکھ دیئے گئے۔ اسی طرح ۱۹۰۰ء میں روس سے ۲۵ لاکھ پونڈ قرض لیے گئے اور شمال مغربی سرحد اور بحرِ خزر کی بندرگاہوں کے محصولات رہن رکھ دیئے گئے۔ ۱۹۰۱ء میں ڈارسی نامی ایک انگریز کو شمالی صوبوں کے علاوہ پورے ملک میں تیل نکالنے کا ٹھیکہ دے دیا گیا۔

آخر نفرت اور برہمی کا لاوا جو کئی سال سے اندر ہی اندر پک رہا تھا ۱۹۰۳ء میں پھوٹ نکلا اور غیر ملکی طاقتوں نے محصولات کی جو شرح مقرر کی اس کے خلاف جگہ جگہ بلوے شروع ہو گئے حکومت نے تشدد سے کام لیا تو ہر طرف سے آئینی حکومت کا مطالبہ ہونے لگا جو مشروطہ کی تحریک بن کر پورے ملک میں پھیل گیا۔ اسی دوران زار روس اور برطانیہ کے درمیان ۳۱/اگست ۱۹۰۷ء کو ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس کی رو سے ایران کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقے روس کے زیر اثر قرار پائے اور جنوب مغربی اور جنوب مشرقی حصے برطانیہ کو ملے۔ اس معاہدے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مشروطہ کی تحریک نے اور شدت اختیار کرلی۔ شاہ نے اپنی حفاظت کے لیے روسی افسروں کی کمان میں ایک کوسیک بریگیڈ بھی بھرتی کی اور زار روس کو فوج بھیج کر آذربائیجان کی انقلابی تحریک کو کچلنے کی دعوت دی مگر انقلابی عناصر ستار خاں کی سربراہی میں عرصے تک دشمنوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس جدوجہد میں قفقاز کی بالشیوک پارٹی نے لینن کی ہدایت پر آذربائیجانی انقلابیوں کی پوری مدد کی۔ ان کی حمایت میں ایک کمیٹی بنائی گئی اور ان ایرانیوں کو جو باکو میں کام کرتے تھے تربیت دے کر تبریز بھیجا گیا تاکہ وہ اپنے ہم وطنوں کے شانہ بہ شانہ لڑیں۔ [۱۳]

لینن کا تبریز کے انقلابیوں سے ۱۹۰۱ء سے رابطہ اس وقت سے تھا جب اس نے سٹٹ گارٹ سے 'اِسکرا' جاری کیا تھا۔ وہ ایران میں زار شاہی اور برطانیہ کی ریشہ دوانیوں پر کڑی نظر رکھتا تھا اور جانتا تھا کہ یہ سامراجی طاقتیں ایران اور ترکی وغیرہ کو بانٹنے کی گھات میں لگی ہیں لیکن ۱۹۰۵ء کے بعد ایشیا اور مشرقی یورپ میں حالات نے نیا رُخ اختیار کیا اور قومی آزادی کی تحریک ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئی۔ لینن نے اس انقلابی رجحان کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> 'مشرقی یورپ اور ایشیا میں بورژوا جمہوری انقلاب کا عہد ۱۹۰۵ء سے پہلے شروع نہیں ہوا۔ روس، ایران، ترکی اور چین پھر جنگِ بلقان، یہ ہیں ہمارے دور میں ہمارے مشرق میں واقعاتِ عالم کی کڑیاں اور کوئی اندھا ہی ہوگا جس کو واقعات کی ان کڑیوں پر بورژوا جمہوری تحریکوں کے پورے ایک سلسلے کی بیداری نظر نہ آتی ہو جو قومی طور پر آزاد اور وحدانی ریاستیں قائم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔' [۱۴]

مشروطہ کی تحریک میں بہت اتار چڑھاؤ آئے (تفصیل کے لیے دیکھو مصنف کی کتاب

'انقلابِ ایران' باب سوئم) تحریک کو کچلنے میں زار روس کی انقلاب دشمن حکومت نے جو کردار ادا کیا اس کی مذمت کرتے ہوئے لینن نے لکھا کہ:

'ایران میں انقلاب دشمن جیت رہے ہیں۔ جاپانیوں سے شرمناک شکست کھانے کے بعد زار روس (ایران میں) انقلاب دشمنوں کی پُرجوش حمایت کر کے اپنی شکست کا انتقام لے رہا ہے۔ کوسیک فوجیوں نے پہلے روس میں قتلِ عام کیا اور لوگوں کے گھر بار لوٹے اور اب ایران میں انقلاب کو کچلنے میں مصروف ہیں لیکن زار نکولس رومانوف جو بدترین قسم کے نوابوں اور سرمایہ داروں کا سرغنہ ہے ہڑتالوں اور خانہ جنگی سے خوف زدہ ہو کر اپنا غصہ اگر ایران کے انقلابیوں پر اتار رہا ہے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ یہ پہلی بار تو نہیں کہ روس کے عیسائی سپاہی بین الاقوامی جلادوں کا کردار ادا کر رہے ہوں۔

'ایرانی انقلابیوں کی حالت نازک ہے۔ ان کے ملک کو ایک طرف ہندوستان کے آقا (انگریز) اور دوسری طرف انقلاب دشمن روسی حکومت آپس میں بانٹنے کے درپے ہیں لیکن تبریز کی زبردست جدوجہد اور جنگ میں فتح کے پڑلے کا بار بار انقلابیوں کے حق میں مڑنا جب کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو حتمی شکست ہو چکی ہے اس بات کی شہادت ہے کہ شاہی بندوقچیوں کو روسی افسروں اور برطانوی سفارت کاروں کی مدد کے باوصف لوگوں کی شدید مزاحمت کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ انقلابی تحریک جو ماضی کو بحال کرنے کی کوششوں کا مسلح مقابلہ کر سکتی ہے اور جو دشمنوں کو ملک کے باہر سے کمک حاصل کرنے پر مجبور کر دیتی ہے کبھی مر نہیں سکتی۔ ان حالات میں ایرانی رجعت پرستوں کی مکمل فتح بھی نئی عوامی بغاوت کا پیش خیمہ ثابت ہوگی'۔ [۱۵]

جنوری ۱۹۱۲ء میں روسی سوشل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی کی کانفرنس پراگ میں منعقد ہوئی تو لینن کی تحریک پر کانفرنس میں 'روسی حکومت کے ایران پر حملے' کے خلاف ایک قرارداد اتفاق رائے

سے منظور ہوئی جس میں لکھا تھا کہ روسی سوشل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی زارشاہی گنڈوں کی سفاکانہ پالیسی کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔ یہ ٹولہ ایرانی عوام کی آزادی سلب کرنے پر تُلا ہوا ہے اور اس پالیسی پر عمل کرتے ہوئے انتہائی ظالمانہ اور شرمناک حرکتوں سے بھی گریز نہیں کرتا۔ یہ کانفرنس اعلان کرتی ہے کہ روسی اور برطانوی حکومتوں کے گٹھ جوڑ کی غرض و غایت ایشیا میں جمہوری قوتوں کی انقلابی تحریک کو کچلنا ہے۔ یہ کانفرنس ایرانی قوم بالخصوص ایرانی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی سے جس کے بہت سے ارکان زارشاہی قصائیوں کے ہاتھوں شہید ہو چکے ہیں غیر مشروط ہمدردی کا اظہار کرتی ہے۔[16]

ترکی کا انقلاب

مارکس کے ذکر میں ہم لکھ چکے ہیں کہ سلطنتِ عثمانیہ کا وجود سامراجی نظام کے پھیلاؤ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا چنانچہ زارروس اور برطانیہ ۱۹ویں صدی کی ابتدا ہی سے سلطنت کا حصہ بخرہ کرنے اور لوٹنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ اقتصادی غلامی چونکہ سیاسی غلامی کی تمہید ہوتی ہے لہٰذا سامراجی طاقتوں نے قرضوں کا آزمودہ اور مجرب نسخہ ترکی میں بھی آزمایا۔ اس کام کے لیے عثمانی بینک کو جو انگریزوں کی ملکیت تھا بطور دلال استعمال کیا گیا اور تب قرضوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۸۵۴ء میں بابِ عالی کو ساڑھے سات کروڑ فرانک رقم ادھار دی گئی مگر بینک نے ڈیڑھ کروڑ کمیشن کے کاٹ لیے۔ ۱۸۵۵ء میں ساڑھے بارہ کروڑ فرانک قرض دیئے گئے اور شام اور اسمرنا کے محصولات کی آمدنی رہن رکھ دی گئی۔ تین سال بعد پھر ساڑھے بارہ کروڑ قرض دیئے گئے مگر اب کے بابِ عالی کو کٹ کٹا کر فقط ساڑھے نو کروڑ ہاتھ آئے اور استنبول (دارالسلطنت) کے محصولات رہن رکھنے پڑے۔ اب حکومت بالکل ہی قرضوں پر چلنے لگی چنانچہ ۱۸۶۰ء اور ۱۸۷۴ء کے درمیان مغربی ساہوکاروں سے گیارہ بار قرض لیا گیا اور قرضے کی مجموعی رقم پانچ ارب ۳۰ کروڑ فرانک ہو گئی لیکن ترکی کو دراصل صرف تین ارب فرانک ملے یعنی فقط ۵۶ فیصد۔

ترکی کو یہ قرضے ملیں اور فیکٹریاں لگانے یا معیشت کی اصلاح کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ ریلوے کی تعمیر کے لیے دیئے گئے تھے۔ لطف یہ ہے کہ ریلوے کی تعمیر میں فی کلومیٹر آمدنی کی ضمانت بھی شامل تھی یعنی حکومت کی ذمے داری تھی کہ وہ ریلوے کی فی کلومیٹر مقررہ آمدنی کی

ضمانت دے اور اگر آمدنی مقررہ رقم سے کم ہو تو یہ کمی سرکاری خزانے سے پوری کی جائے۔ضمانت کی ادائیگی کے لیے مزید قرضوں کی ضرورت پڑی مگر ناعاقبت سلطانوں نے بالکل نہ سوچا کہ قرض کی مئے پینے کا انجام بُرا ہوتا ہے۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ نمک اور تمباکو کے علاوہ بھیڑ بکریوں پر بھی ٹیکس لگا اور ٹیکس کی کُل آمدنی رہن رکھ دی گئی اور ۱۸۸۳ء میں ریگی نامی ایک غیر ملکی کمپنی کو نمک اور تمباکو کی خرید و فروخت اور سگریٹ سازی کی اجارہ داری سونپ دی گئی۔نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کی اقتصادی حالت بالکل ابتر ہو گئی چنانچہ ترکی کی زبوں حالی پر تبصرہ کرتے ہوئے موؤرخ لکھتا ہے کہ:

> ’عثمانی سلطنت ایک طرح کی یورپی کالونی بن گئی جس کا کام مغربی ملکوں کو سستا خام مال اور وہاں کی مصنوعات کے لیے ایک وسیع بازار فراہم کرنا تھا۔اسی دوران میں مغربی سرمائے کی کھپت بھی بڑھ گئی اور اس کو نہایت نفع بخش مراعات دے دی گئیں۔جو کمی رہ گئی تھی اس کو ۱۸۵۴ء میں شاہی قرضوں نے پورا کر دیا۔یہ قرضے بے حد تباہ کن شرطوں پر برطانیہ اور فرانس سے حاصل کیے گئے تھے۔سرکاری آمدنی کے کئی اہم ذرائع ’’سود کی ادائیگی کے لیے ان طاقتوں کے ہاتھ رہن رکھ دیئے گئے‘‘۔[۱۷]

مالیاتی سرمائے کے اس غلبے سے مغربی مصنوعات کی درآمد کے لیے میدان بالکل صاف ہو گیا اور بازار میں ان سستی مصنوعات کی بھرمار سے ملک کی رہی سہی گھریلو صنعتیں بھی برباد ہو گئیں اور درآمد برآمد سے کئی گنا بڑھ گئی۔

سال	درآمد (ملین لیرا)	برآمد (ملین لیرا)
۱۸۸۰ء	۱۷٫۸	۸٫۵
۱۹۰۰ء	۲۳٫۸	۱۴٫۹
۱۹۱۳ء	۴۰٫۸	۲۱٫۴

اسی اثناء میں پیرس میں مزدوروں کی انقلابی جدوجہد شروع ہوئی جو پیرس کمیون کے نام سے مشہور ہے۔تعلیم یافتہ نوجوان ترک جن میں ابراہیم شناسی، نامق کمال، ضیا پاشا اور مصطفیٰ فاضل پاشا وغیرہ سرِ فہرست ہیں انقلابِ فرانس سے بہت متاثر ہوئے۔نامق کمال تو اس تاریخی حادثے کا عینی شاہد تھا۔اس نے استنبول واپس آ کر اپنے انقلابی اشعار اور ڈراموں سے ملک میں ہلچل

مجادی اور ایک جمہوری آئین کا مسودہ بھی شائع کیا۔ ان حالات نے سلطان عبدالعزیز کو بے حد خوفزدہ کر دیا۔ لہٰذا بڑے پیمانے پر پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ نامق کمال اور کئی دوسرے ممتاز افراد قید کر دیئے گئے اور بے شمار ادیبوں اور محب وطن ترکوں نے یورپ میں پناہ لی۔ جب تشدد بہت بڑھ گیا تو مدحت پاشا نے جو صوبہ ڈینوب اور عراق کا گورنر رہ چکا تھا اور نوجوان ترکوں کے نصب العین سے ہمدردی رکھتا تھا، سلطان عبدالعزیز کو تخت سے اتار کر اس کے بھتیجے سلطان عبدالحمید دوئم (۱۸۷۶ء۔۱۹۰۹ء) کو تخت پر بٹھا دیا۔ مدحت پاشا صدراعظم مقرر ہوا اور ترکی میں پہلی بار ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء کو قانون اساسی سلطان کے دستخط سے نافذ کیا گیا۔ سلطان نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر حلفِ وفاداری اٹھایا اور عہد کیا کہ میں آئین سے کبھی انحراف نہیں کروں گا۔ تب آئین کے مطابق دو ایوانوں پر مشتمل مجلسِ شوریٰ ملّی منتخب ہوئی اور پورے ملک میں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔

لیکن یہ خوشیاں چند روزہ تھیں کیونکہ ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ سلطان اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو گیا۔ مدحت پاشا کو طائف میں قید کر دیا گیا اور بعد میں قتل۔ نامق کمال جزیرے میں نظر بند ہوا اور سلیمان پاشا کو بغداد جیل میں بند کر دیا گیا جہاں کچھ عرصے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ آئین معطل ہو گیا، پارلیمنٹ توڑ دی گئی اور ترقی پسندوں کے خلاف دارو گیر کی ملک گیر مہم شروع ہوئی۔ اس 'کارِ خیر' میں علماء کرام نے سلطان کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ شیخ الاسلام نے فتویٰ صادر کیا کہ آئین پسند 'سرخے' ہیں یعنی پیرس کمیون کے ایجنٹ ہیں۔ سُرخروئی کی خاطر شہاب الدین احمد ربعی کی کتاب 'سلوک الممالک فی تدبیر الممالک' سلطان کی خدمت میں بطور سند پیش کی گئی۔ لبِ لباب یہ تھا کہ 'آئین پسند مفسد ہیں۔ وہ آزادیٔ تقریر اور جمہوریت کے پردے میں سیکولرازم اور الحاد کا پروپیگنڈا کرتے ہیں اور یہ کہ آزادیٔ تقریر مہمل اصطلاح ہے۔ اسلامی ریاست کی اساس نہ اشرافیہ ہے نہ جمہوریت بلکہ خلافتِ عثمانیہ ہے۔ لہٰذا اقتدارِ اعلیٰ کا مالک خدا ہے اور خدا کا نائب سلطان خلیفہ'۔

سلطان عبدالحمید دوئم کے ظلم و جبر کا مقابلہ کرنے کے لیے استنبول کے فوجی کالج کے طلبا نے ۱۸۸۹ء میں ایک خفیہ جماعت 'عثمانی اتحاد و ترقی' کے نام سے بنائی۔ ۱۸۹۶ء میں حکومت کو اس تنظیم کا سراغ مل گیا لہٰذا جو بھاگ سکے انہوں نے فرانس میں پناہ لی بقیہ گرفتار ہوئے۔ کچھ عرصے

بعد انجمن نے اپنے ٹوٹے ہوئے تار پھر جوڑے مگر اب کے 'اتحاد و ترقی' کا خفیہ مرکز سالونیکا (یورپی ترکی) میں قائم ہوا۔ کمال اتاترک سالونیکا کے اسی فوجی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۹۰۵ء کے روسی انقلاب اور ایران کی مشروطہ تحریک نے ترکوں کے جذبۂ عمل میں نئی روح پھونکی اور جب ۱۹۰۷ء میں یہ خبر گرم ہوئی کہ شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم اور زار نکولس کے درمیان عثمانی سلطنت کے حصے بخرے کرنے کا خفیہ معاہدہ ہوا ہے تو نوجوانِ ترک میدانِ عمل میں اتر آئے۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں کی حامی فوج استنبول میں داخل ہوگئی عبدالحمید کو تخت سے برطرف کر دیا گیا۔ ۱۸۷۶ء کا آئین بحال ہوا اور نوجوان ترکوں نے انور پاشا، جمال پاشا اور سعید حلیم پاشا کی قیادت میں حکومت کی باگ سنبھال لی۔

یورپ کے لبرل پریس نے اس تبدیلی کا خیر مقدم ضرور کیا مگر خالدہ ادیب خانم کے بقول 'یورپ کو گاہک درکار نہ کہ حریف' چنانچہ مغربی طاقتوں نے ترکی کی نئی حکومت کے خلاف سازش شروع کر دی۔

لینن ترکی کے حالات کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ سامراجی طاقتوں کی ریشہ دوانی اور منافقانہ حکمتِ عملی سے بھی بخوبی واقف تھا۔ اس نے جولائی ۱۹۰۸ء میں جب کہ نوجوان ترک ہنوز سلطان عبدالحمید کو برطرف نہیں کر پائے تھے ترکی انقلاب کو سراہتے ہوئے لکھا کہ:

> 'ترکی میں فوج کی انقلابی تحریک نے جس کی قیادت ''نوجوانِ ترک'' کر رہے تھے فتح حاصل کر لی۔ یہ سچ ہے کہ فتح ابھی ادھوری ہے بلکہ اس سے بھی کم کیونکہ ترکی کے نکولس دوئم (سلطان عبدالحمید دوئم) ابھی تک تو مشہور آئین کی بحالی کا وعدہ کر کے اپنے کو بچانے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن انقلاب میں ایسی ادھوری کامیابیاں، پرانی حکومت سے جلدی میں اور زبردستی لی ہوئی مراعات خانہ جنگی کے شدید نشیب و فراز کے دوران نئے اور فیصلہ کن اقدام کی پکی ضمانت بن جاتی ہیں جن میں عوام وسیع پیمانے پر شرکت کرتے ہیں۔ خانہ جنگی وہ درس گاہ ہے جس کا سبق قومیں کبھی نہیں بھولتیں...... یہی وہ درس گاہ ہے جو مظلوموں کو مقابلہ کرنا اور انقلاب کو کامیاب بنانا سکھاتی ہے۔ اسی کے دوران دورِ حاضر کے

غلاموں کی نفرت ایک مقام پر مرکوز ہوتی ہے، وہی نفرت جو گرے ہوئے، پسے ہوئے، بے یارومددگار غلاموں نے سدا اپنے دلوں میں محفوظ رکھی اور جو غلاموں کی جن کو اپنی غلامی کی ذلتوں کا شعور پیدا ہوا، تاریخ ساز کارناموں کی جانب رہبری کرتی ہے۔'[۱۸]

لینن نے چند ماہ کے اندر ہی محسوس کر لیا کہ سامراجی طاقتوں نے انقلابِ ترکی کو خلوصِ دل سے تسلیم نہیں کیا ہے، نہ وہ ترکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے کبھی باز آنے والی ہیں۔ اس نے ۸/اکتوبر ۱۹۰۸ء کو ترکوں کو متنبہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

'ترکی کا انقلاب دشمن طاقتوں کے نرغے میں ہے۔ ہر چند کہ یورپی پریس کے لہجے اور سفارت کاروں کے بیانات اس خطرے کی تردید کرتے ہیں۔ اگر ہم ان بیانوں اور نیم سرکاری پریس پر اعتبار کریں تو ہم کو ہر طرف اس نوزائیدہ ترکی سے 'ہمدردی ہی ہمدردی' نظر آئے گی، وہاں کی آئینی حکومت کے استحکام کی عام آرزو اور بورژوا نوجوانوں ترکوں کے 'اعتدال' کی ثناوصفت۔ لیکن یہ میٹھے میٹھے الفاظ یورپ کی موجودہ رجعت پرست حکومتوں اور رجعت پرست بورژوا طبقے کی گھٹیا بورژوا منافقت کا مثالی نمونہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک یورپی ملک نے جو جمہوریت کا مدعی ہے اور کسی ایک یورپی پارٹی نے خواہ وہ جمہوری ہونے کی دعویدار کیوں نہ ہو یا کسی ترقی پسند یا لبرل یا ریڈیکل گروہ نے انقلابِ ترکی کی فتح اور استحکام کو ترقی دینے کی مخلصانہ خواہش کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ اس کے برعکس یہ سب کے سب ترک انقلاب کی کامیابی سے خوف زدہ ہیں کیونکہ اس انقلاب کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک طرف تمام بلقانی قوموں میں خودمختاری اور سچی جمہوریت کی آرزو کو فروغ ملے گا اور دوسری طرف ایرانی انقلاب کی فتح یقینی ہو جائے گی، ایشیا میں جمہوری تحریک کو مزید بڑھاوا ملے گا اور ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد اور تیز ہوگی، روس کی وسیع وعریض سرحدوں پر آزاد ادارے وجود میں آئیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا

کہ زار شاہی کی پالیسی میں رکاوٹ پڑے گی اور روس میں انقلاب کے لیے فضا ساز گار ہوگی۔ ان دنوں بلقان، ترکی اور ایران میں جو واقعات پیش آ رہے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایشیا میں جمہوریت کی چڑھتی ہوئی لہر کے خلاف یورپی طاقتوں کا انقلاب دشمن اتحاد ایک ملی بھگت ہے۔ ہماری حکومتوں کی تمام کوششوں کا اور ''بڑے بڑے'' یورپی اخباروں کی تمام ہرزہ سرائیوں کا مقصد اسی حقیقت کی پردہ پوشی کرنا ہے، لوگوں کو گمراہ کرنا ہے اور ایشائی قوموں کے خلاف جو جمہوریت کی جنگ میں مصروف ہیں یورپ کی نام نہاد مہذب قوموں کی انقلاب دشمن ملی بھگت کو منافقانہ تقریروں اور ڈپلومیٹک عیاروں سے چھپانا ہے۔ ایسی صورت میں محنت کشوں کا فرض ہے کہ ان بورژوا منافقوں کے چہرے پر پڑی ہوئی نقاب کو نوچ کر پھینک دیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو یورپی حکومتوں کے رجعت پرستانہ کردار سے آگاہ کریں جو اپنے ملک کے محنت کشوں کی جدوجہد سے ڈر کر ایشیائی انقلاب کو دبانے کے درپے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کام میں مدد دے رہے ہیں۔

'اپنے مقبوضات اور نوآبادیات میں توسیع کی غرض سے بڑے سے بڑا ٹکڑا ہتھیانے کے سلسلے میں سرمایہ دار طاقتوں کی باہمی رقابت اور یورپ کی تابع یا ''زیرِ حفاظت'' قوموں میں آزاد جمہوری تحریک کا خوف ــــ یورپی حکمتِ عملی کے دو سرچشمے ہیں'۔ [19]

جنگِ طرابلس

لینن کے اندیشے درست نکلے۔ سامراجی طاقتوں نے ترکی کی نئی حکومت کو معیشت کی اصلاح کی مہلت ہی نہ دی۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۱۱ء کو اٹلی نے بابِ عالی کو اچانک الٹی میٹم دے دیا کہ 'ہر گاہ کہ اٹلی طرابلس الغرب کو ترقی کی برکتوں سے سرفراز کرنا چاہتا ہے مگر ترکی اس کے اس ''جائز'' عمل کی راہ میں روڑے اٹکا رہا ہے۔ لہٰذا اٹلی اب ترکی سے بیکار گفت وشنید میں وقت ضائع نہیں کرے گا۔

اپنے وقار اور مفاد کے تحفظ کی غرض سے اٹلی نے طرابلس پر فوجی قبضہ کرنے کا عزم کرلیا ہے۔ پس ترکی کو لازم ہے کہ اپنے عہدے داروں کو ہدایت کردے کہ مزاحمت نہ کریں'۔ اس عجیب و غریب الٹی میٹم پر عمل کرنے کے لیے ترکی کو ۲۴ گھنٹوں کی 'مہلت' دی گئی۔

اٹلی جس کے بیشتر علاقوں پر ۱۸۷۰ء تک آسٹریا کا قبضہ تھا اور ملک کئی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا آزاد مملکت بنتے ہی دوسرے ملکوں کی آزادی سلب کرنے کے منصوبے بنانے لگا تھا۔ پس ماندہ دنیا کی تقسیم پر قبضے کی دوڑ میں وہ دوسروں سے پیچھے کیوں رہتا۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء میں اٹلی نے طرابلس کا رُخ کیا۔ برطانیہ کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس کی رو سے اٹلی نے وعدہ کیا کہ وہ مصر پر برطانوی قبضے کی حمایت کرے گا اور اس کے عوض برطانیہ طرابلس پر اطالوی قبضے پر معترض نہ ہوگا ۱۸۸۷ء میں اٹلی نے جرمنی، آسٹریا اور اسپین کے ساتھ اسی نوع کے معاہدے کرکے یورپی طاقتوں کی تائید حاصل کرلی۔ ۱۹۰۲ء میں فرانس سے بھی سمجھوتہ ہوگیا اور طے پایا کہ اٹلی مراکش پر فرانسیسی غلبے سے تعرض نہ کرے اور فرانس طرابلس پر اطالوی قبضے کی مخالفت نہ کرے گا۔

اب یورپ کی فقط ایک طاقت کی تائید باقی رہ گئی تھی اور وہ تھا روس۔ چنانچہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۹ء کو دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوگئے جس میں اٹلی نے درۂ دانیال کے علاقے پر روس کے کلیم کو تسلیم کرلیا اور زار روس نے طرابلس پر اطالوی کلیم کو۔

الٹی میٹم ملتے ہی ترکی کے سفیروں نے لندن، پیرس، وئینا اور سینٹ پیٹرس برگ میں اٹلی کی اس قزاقانہ حرکت کے خلاف فریاد کی مگر ہر جگہ سے ٹکا سا جواب ملا کہ یہ تمہارا اور اٹلی کا معاملہ ہے۔۔۔ 'تم خود نمٹو'۔۔۔ ترکی اس جنگ کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ حتیٰ کہ طرابلس کا گورنر اور فوج کا سپہ سالار دونوں طرابلس سے غیر حاضر تھے اور وہاں فقط سات ہزار فوج موجود تھی۔ اٹلی نے حملہ کرتے ہی اپنے جنگی جہازوں سے طرابلس کے ساحل کی ناکہ بندی کردی تاکہ ترک کمک نہ بھیج سکیں۔ ترکی نے مصر کے راستے خشکی سے فوجیں بھیجنی چاہیں تو برطانیہ نے اجازت دینے سے انکار کردیا۔ آخر اٹلی کی فتح ہوئی اور طرابلس کو اطالوی سلطنت میں شامل کرکے اس کو لیبیا کا نام دیا گیا۔

جنگِ طرابلس نے برِصغیر کے لوگوں بالخصوص مسلمانوں کے جذبات کو سخت مجروح کیا۔ وہ ترکی کی مدد کرنا چاہتے تھے مگر وہ خود غلام تھے اور نہتے۔ وہ ترکی کی مدد کیونکر کرتے۔ البتہ علامہ

اقبالؔ نے اپنی نظموں (’طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں‘ اور ’فاطمہ تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے‘) اور مولانا ابوالکلام آزادؔ نے ’الہلال‘ میں اہلِ ہند کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی۔ ان کو یہ جاننے میں بھی دیر نہ لگی کہ اٹلی نے برطانیہ اور فرانس کی ایما پر یہ جارحانہ حملہ کیا ہے۔

لینن نے جنگِ طرابلس کی سخت مذمت کی اور لکھا کہ:

’اٹلی جنگ ’’جیت‘‘ گیا ہے جو اس نے ایک سال قبل افریقہ میں ترکی مقبوضات پر قبضہ کرنے کے لیے شروع کی تھی۔ اب طرابلس کا مالک اٹلی ہوگا۔ اس ’’مثالی‘‘ نوآبادیاتی جنگ پر ایک نظر ڈالیں جس کا سہرا ایک ’’مہذب‘‘ قوم کے سر ہے۔

’اس جنگ کی غرض و غایت کیا تھی؟ اٹلی کے ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کی ہوسِ زر ـــ ان کو نئے بازاروں اور اطالوی سامراج کو نئے نئے کارناموں کی آرزو ہے۔

’یہ کس قسم کی جنگ تھی؟ ایک مکمل اور ’’مہذب‘‘ خونی غسل ـــ جدید ترین ہتھیاروں سے عربوں کا قتلِ عام مگر عربوں نے بھی جم کر مقابلہ کیا۔ چنانچہ جنگ کے ابتدائی دنوں میں جب اٹلی کے بحری افسروں نے بے احتیاطی برتی اور ۱۲سو بحری سپاہی ساحل پر اتار دیئے تو عربوں نے چھ سو سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انتقام میں تین ہزار عرب ذبح کردیئے گئے۔ پورے پورے خاندانوں کا صفایا کردیا گیا۔ ان کے گھربار لوٹ لیے گئے۔ عورتوں اور بچوں تک کو نہایت سفاکی سے قتل کیا گیا۔ اٹلی والے آخر ہیں نا ’’مہذب‘‘ اور آئین پسند ایک ہزار عرب سولی پر لٹکا دیئے گئے۔ اس جنگ میں اٹلی کو اسّی کروڑ لیرا خرچ کرنے پڑے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں شدید بیروزگاری پھیل گئی اور صنعت پر جمود طاری ہوگیا‘۔

لینن آگے چل کر لکھتا ہے کہ:

’ہر چند کہ اس جنگ میں ۱۴ہزار آٹھ سو عرب کام آئے ہیں مگر ’’صلح‘‘

کے باوجود یہ جنگ جاری رہے گی کیونکہ اندرونِ ملک کے اور ساحل سے دور کے عرب قبیلے ہرگز اطاعت قبول نہ کریں گے اور ان کو بہت دن تک سنگینوں، گولیوں، پھانسی کے پھندوں، آتش زنیوں اور زنا بالجبر کے ذریعے ''تہذیب'' سکھائی جائے گی۔'[۲۰]

اور واقعہ یہ ہے کہ عرب قبیلے بیس برس تک اطالوی فوجوں سے لڑتے رہے۔

جنگِ بلقان

ابھی جنگِ طرابلس کے زخم تازہ تھے کہ جنگِ بلقان کے نقارے بجنے لگے اور یونان، بلغاریہ، سربیا اور مانٹی نیگرو نے ترکی پر یلغار کردی۔ اس بار بھی حملے میں برطانیہ اور روس کی شہ شامل تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قسطنطنیہ کے قرب وجوار کے علاوہ یورپ کا باقی ماندہ علاقہ بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ (یہی وہ جنگ ہے جس میں ہندوستانی وطن پرستوں کا میڈیکل مشن ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں ترکی گیا تھا) مگر جنگ کے بعد خود حملہ آوروں میں علاقے کی تقسیم پر آپس میں ٹھن گئی اور لڑائی ۱۹۱۳ء تک جاری رہی۔ جنگِ بلقان دراصل پہلی عالمگیر جنگ کا پیش خیمہ تھی۔

جنگِ بلقان بہ ظاہر عثمانی اقتدار کے خلاف قومی آزادی کی جنگ تھی لیکن حقیقت میں اس وقت بلقانی قوموں کی حیثیت یورپ کی بساط سیاست پر بڑی طاقتوں کے مہروں سے زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ لینن نے صورتِ حال کے اس پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ۱۶ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کو لکھا تھا کہ:

'بلقان کے باشندے بھی ہمارے (روس) زمین سے بندھے ہوئے کسانوں کی طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو مالک کی برہمی اور محبت دونوں سے بچاؤ۔ دونوں ہی ہمارے لیے عذاب ہیں کیونکہ بلقان کے کسانوں اور مزدوروں کے حق میں یورپین طاقتوں کی دوستی اور دشمنی دونوں ان کی بیڑیوں اور زنجیروں میں اضافہ کرتی ہیں اور ان کی آزادانہ ترقی کی راہ میں حائل ہیں...... بلقانیوں کے لیے یورپ کی انتہائی ''لبرل'' بورژوا حکومت بھی انحطاط وجمود کا باعث ہوگی اور اس کی افسر شاہی آزادی کے

راستے میں روڑے اٹکائے گی۔ وہ ''یورپ'' ہی ہے جو بلقان میں وفاقی ری پبلک کے قیام میں مانع ہے۔ بلقان کے جمہوریت پسند اور باشعور مزدوروں کی تو بس یہی آرزو ہے کہ عوام کا سیاسی شعور اونچا ہو اور ان کی آزاد جدوجہد ترقی کرے۔ ان کو بورژوا سیاست دانوں کی سازشوں سے خواہ وہ کتنی ہی چکنی چپڑی زبان کیوں نہ استعمال کریں کوئی توقع نہیں'۔[۲۱]

بلقان میں آبادی کی غالب اکثریت چونکہ سلاف قوم سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا زارشاہی بلقان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کو اپنا حق سمجھتی تھی اور روس کے نسل پرست حلقے سلاف اور ترک باشندوں کے درمیان نفرت کو ہوا دیتے رہتے تھے۔ اس کے برعکس لینن کا کہنا تھا کہ سلاف اور ترک عوام کا مفاد ایک ہے۔ دونوں برابر کے مظلوم ہیں لہٰذا ان کے درمیان نسلی عداوت کا زہر پھیلانا اور ان میں پھوٹ ڈالنا ان سے دشمنی کرنا ہے لینن نے روسی نسل پرستوں کی شاونیت کی مذمت کرتے ہوئے لکھا:

'ایک قوم کے مظلوموں نے دوسری قوم کے مظلوموں کے خلاف جنگ کر کے کبھی آزادی حاصل نہیں کی ہے۔ عوام کے مابین جنگ ان کی غلامی کو تقویت پہنچاتی ہے۔ بلقان میں سلاف قوم کے کاشتکاروں کو اور انہیں کے ساتھ ترک کاشتکاروں کو حقیقی آزادی اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب (بلقان کا) ہر ملک آزاد ہو اور جمہوری ریاستوں کے درمیان سچا وفاق قائم ہو۔ سلاف اور ترک کسان بھائی بھائی ہیں اور دونوں ہی اپنے زمینداروں اور حکومتوں کے ستائے ہوئے ہیں۔ حقیقی ظلم و تعدی کی جڑ یہی ہے'۔[۲۲]

روس کے بورژوا حلقے بلقان کی سلاف آبادی کے تحفظ کا مطالبہ کرتے نہ تھکتے تھے۔ اس کے جواب میں لینن نے لکھا کہ:

'اس شوروغل کا واحد مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی توجہ روس کے اندرونی مسائل سے ہٹ جائے اور ترکی کا کچھ علاقہ ہتھیا لیا جائے۔ ملک کے اندر سامراجی لوٹ کی حمایت اور ملک کے باہر ''حب الوطنی'' کا سوانگ بھر کر

''سلاف دوستی'' کا ڈھونگ ہے۔ یہ ہے ان کی بھونڈی پالیسی کا لب لباب ___ لبرل اور نیشنلسٹ دونوں حلقے دو مختلف زاویوں سے یورپی بورژوا کے ہاتھوں بلقانیوں کی لوٹ اور غلامی کی تائید میں دلیلیں دے رہے ہیں۔ فقط محنت کش طبقے کی پالیسی جمہوری ہے، ہر قسم کے تحفظ، لوٹ اور مداخلت کی مخالفت اور آزادی اور جمہوریت کی حمایت'۔[۲۳]

لینن محکوم قوموں کے حقِ خوداختیاری کا زبردست حامی تھا بشرطیکہ اس سے عوام کو جمہوری حقوق ملیں اور آزادی نصیب ہو۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ محکوم قومیں بیرونی سرمایہ دار طاقتوں کی آلۂ کار بنیں کیونکہ ان طاقتوں کو محکوم قوموں کی حقیقی آزادی سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی بلکہ ان کا مقصد فقط استحصال ہوتا ہے۔ لہٰذا جو آزادی بیرونی سرمایہ دار طاقتوں کی مدد سے حاصل کی جائے وہ فرضی اور ناپائیدار ہوتی ہے۔ لینن کی نظر میں مسئلہ بلقان کا واحد حل یہ تھا کہ بلقان میں آباد تمام قومیں بلاامتیاز مذہب وملت متحد ہوکر اپنے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف جدوجہد کرتیں اور کامیابی کی صورت میں اپنی وفاقی ری پبلک قائم کرتیں جس میں ہر قوم کو مساوی حق حاصل ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا اور جو ہوا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لینن نے ۲۹ مارچ ۱۹۱۳ء کو لکھا کہ:

'جنگِ بلقان واقعاتِ عالم کی زنجیر کی ایک کڑی ہے جو ایشیا اور مشرقی یورپ میں قرونِ وسطیٰ کے حالاتِ زیست کے خاتمے کی نشاندہی کرتی ہے۔ بلقان میں متحدہ قومی ریاستوں کی تشکیل، مقامی فیوڈل حاکموں کے ظلم وتشدد سے گلوخلاصی اور تمام قومیتوں کے بلقانی کاشتکاروں کی بڑے زمینداروں کی غلامی سے مکمل آزادی، یہ تھا اہلِ بلقان کا تاریخی فریضہ۔ آج یہ فریضہ جس طرح ادا ہو رہا ہے بلقان کے لوگ اپنی وفاقی ری پبلک بنا کر اس کو دس گنا آسانی سے اور سو گنا کم قربانیوں سے سرانجام دے سکتے تھے۔ مکمل اور مستقل جمہوریت میں قومی تفوق اور تشدد، قومی جھگڑے اور مذہبی اختلافات کی اشتعال انگیزی ناممکن ہوجاتی اور بلقانی عوام کو جلد جلد اور وسیع پیمانے پر آزادی سے ترقی کی ضمانت مل جاتی۔

'مسائل بلقان کو جنگ کے ذریعے حل کرنے کا ایسی جنگ کے

ذریعے جس کے پیچھے بورژوائی اور خاندانی مفادات کارفرما تھے، اصل سبب بلقان میں پرولتاریہ کی کمزوری تھی اور طاقتور یورپی بورژوا کا رجعت پرستانہ اثر اور دباؤ۔ یہ طبقہ اپنے ملک میں اور بلقان میں بھی حقیقی آزادی سے خوف زدہ رہتا ہے۔ اس کا واحد مقصد دوسروں کے صرفے پر نفع حاصل کرنا ہے۔ وہ جارحانہ وطنیت (شاونیت) اور قومی عداوت کو ہوا دیتا ہے تاکہ لوٹ کھسوٹ کی پالیسی چلانے میں سہولت ہو اور بلقان کے مظلوم طبقوں کی آزادترقی رُک جائے'۔[۲۴]

یہ وہ زمانہ تھا جب مشرق کے ہر گوشے سے انقلاب کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ چین میں مانچو خاندان کی سالہ بادشاہت کا تختہ الٹا جا چکا تھا اور ڈاکٹر سُن یات سین کی قیادت میں چینی ری پبلک قائم ہوئی تھی البتہ یورپ کی سامراجی طاقتیں چینی ری پبلک کے دشمنوں کی اسلحوں اور پیسوں سے بھرپور مدد کر رہی تھیں۔ ایران اور مصر میں بھی وہ وطن پرست عناصر کے مخالفوں کی پشت پناہ بنی ہوئی تھیں اور ہندوستان میں بھی اسی حکمتِ عملی پر کاربند تھیں۔ مقصد قومی آزادی کی تحریک میں رخنے ڈالنا اور ان عناصر کو تقویت پہنچانا تھا جو اپنے ذاتی اور طبقاتی مفاد کی خاطر سامراج کی ہوا خواہی کرتے ہوں۔ سامراج کے حمایتی عموماً نواب اور بڑے بڑے جاگیردار تھے البتہ سرمایہ دار طبقے کا مفاد چونکہ سامراجی سرمایہ داروں کے مفاد سے ٹکراتا تھا لہٰذا وہ آزادی کی تحریکوں کی حمایت کرتے تھے ___ کبھی علانیہ کبھی خفیہ طور پر ___ لینن نے مئی ۱۹۱۳ء میں اپنے مضمون 'پس ماندہ یورپ اور ترقی یافتہ ایشیا' کے چونکا دینے والے عنوان سے ان حالات کا تجزیہ کیا اور لکھا کہ:

'کون نہیں جانتا کہ یورپ ترقی یافتہ ہے اور ایشیا پس ماندہ ہے لیکن اس مقالے کا عنوان ایک تلخ حقیقت ہے.... اب یہی مہذب اور ترقی یافتہ یورپ ہر پس ماندگی، دقیانوسیت اور فرسودہ چیز کی حمایت کرتا ہے۔ بورژوا طبقہ اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا ہے اور اپنے گرتے ہوئے غلامانہ نظام کو محفوظ رکھنے کی خاطر گھٹیا اور رد کردہ قوتوں سے ناتا جوڑ رہا ہے۔

'یورپ کے بورژوا طبقے کے زوال و انحطاط کی سب سے نمایاں شہادت اس کی ایشیا میں رجعت پرست عناصر کی حمایت ہے اور یہ سب

کچھ ساہوکاروں کی چالبازیوں اور سرمایہ دار ٹھگوں کے مفاد کی خاطر۔

'ایشیا میں ہر جگہ نہایت طاقتور جمہوری تحریک ترقی کر رہی ہے، پھیل رہی ہے اور طاقت پکڑ رہی ہے۔ وہاں کا بورژوا ابھی تک رجعت کے خلاف عوام کا ساتھ دے رہا ہے۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں میں زندگی، روشنی اور آزادی کی روح بیدار ہو رہی ہے۔ یہ تحریک طبقاتی شعور رکھنے والے سبھی محنت کشوں کے دلوں کو گرماتی ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اجتماعیت کی راہ جمہوریت سے ہو کر گزرتی ہے۔ یورپ کے دیانت دار جمہوریت پسند نوجوان ایشیا سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں...... نوجوان ایشیا کو یعنی ایشیا کے کروڑوں محنت کشوں کو معلوم ہے کہ دنیا کے مہذب ملکوں کے محنت کش ان کے معتبر دوست اور حلیف ہیں۔ ان کی فتح کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ وہ یورپ کے عوام اور ایشیا کے عوام کو آزاد کر کے دم لیں گے۔' [۲۵]

ہندوستان

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جنگِ روس و جاپان اور ۱۹۰۵ء کے انقلابِ روس سے ہندوستان کے وطن پرست حلقوں میں امید کی نئی لہر دوڑ گئی۔ ان دنوں بنگال کا تعلیم یافتہ طبقہ سیاسی شعور میں سب پر سبقت رکھتا تھا۔ وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے جو بڑا عیار سیاست داں تھا بنگالیوں کے بدلتے ہوئے تیور دیکھے (اس وقت تک برطانوی ہند کا دارالحکومت کلکتہ تھا) تو بنگالیوں کی قومی یکجہتی کو توڑنے اور ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی غرض سے مشرقی بنگال کو جہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی الگ صوبہ بنا دیا۔ یہ حربہ اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان غلط فہمیاں برابر بڑھتی چلی گئیں۔ انگریزوں ہی کے اشارے پر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکے میں مسلم لیگ قائم ہوئی اور مسلمانوں کا ایک وفد سر آغا خاں کی قیادت میں وائسرائے لارڈ منٹو سے شملہ میں ملا اور جداگانہ انتخاب کی تجویز پیش کی۔

تقسیمِ بنگال کے نتیجے کے طور پر جو واقعات رونما ہوئے ان سے ہندوؤں اور مسلمانوں ہی

کے درمیان پھوٹ نہیں پڑی بلکہ کانگریس بھی دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک طرف بال گنگادھر تلک، بپن چندر پال اور لالہ لاجپت رائے تھے جو راست اقدام اور بدیسی مال کے بائیکاٹ کے حق میں تھے اور دوسری طرف اعتدال پسند لیڈر سر فیروز شاہ مہتا، سرسُریندر ناتھ بینرجی اور گوکھلے تھے۔ چنانچہ سورت کانگریس میں (۱۹۰۷ء) فریقین میں مخالفت نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ انتہا پسند گروہ کانگریس ہی سے الگ ہو گیا۔

اسی اثناء میں سودیشی تحریک نے زور پکڑا تو حکومت نے اس کو بڑی بے دردی سے کچلنے کی کوشش کی۔ مولانا حسرتؔ موہانی سودیشی تحریک کے بڑے حامی تھی۔ انہوں نے علی گڑھ میں ایک سودیشی اسٹور کھول رکھا تھا اور اپنے رسالے 'اردوئے معلیٰ' میں انگریزی مال کے بائیکاٹ پر مضامین بھی لکھتے رہتے تھے۔ 'اردوئے معلیٰ' میں ایک مضمون مصر میں برطانوی تشدد کے خلاف چھپا تو مولانا کو دو سال قید با مشقت کی سزا ہو گئی اور پریس اور سودیشی اسٹور دونوں ضبط کر لیے گئے۔ تلک اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے مانڈے (برما) بھیج دیا گیا۔ بدیسی مال کی دکانوں پر پکٹنگ ہونے لگی تو دھرنا دینے والوں پر جو بالکل نہتے اور پُر امن تھے جگہ جگہ گولی چلی، لاٹھیاں برسائی گئیں اور ہزاروں افراد قید ہوئے۔ انگریزوں کی اسی دہشت گردی کا ردِ عمل تھا جو ملک میں پہلی بار نوجوان وطن پرستوں نے دہشت انگیزی کی خفیہ تحریک شروع کی۔ ان کا خیال تھا کہ لات کا بھوت بات سے نہیں مانے گا۔ انگریزوں کو اپنی طاقت کا گھمنڈ ہے تو یہ نشہ بموں اور گولیوں ہی سے اُتارا جا سکتا ہے۔ لینن نے ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۹۰۸ء میں لکھا تھا کہ:

> 'ہندوستان میں کچھ دنوں سے "مہذب" برطانوی سرمایہ داروں کے مقامی غلام اپنے "آقاؤں" کے لیے پریشانی کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی نظامِ حکومت نے جو دہشت انگیزی اور لوٹ مار مچا رکھی ہے اس کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ تم کو روس کے علاوہ دنیا میں اتنے بڑے پیمانے پر غربت اور مستقل فاقہ کشی کی مثالیں اور کہیں نہیں ملیں گی۔ آزاد برطانیہ کے انتہائی لبرل اور ریڈیکل افراد جان مورلے (وزیرِ ہند) جیسے افراد ہندوستان کے حاکم مقرر ہوتے ہی چنگیز خان بن جاتے ہیں۔ وہ ملک کی رعایا کو دبانے کے لیے ہر قسم کا طریقہ اختیار

کرنے کی اجازت دیتے ہیں حتیٰ کہ سیاسی مخالفین کو کوڑے لگانے کی بھی۔ برطانوی سوشلسٹوں کا چھوٹا سا ہفت روزہ اخبار ''جسٹس'' کا داخلہ ہندوستان میں ممنوع ہے۔ لبرل اور ''ریڈیکل'' بدمعاشوں نے اور جب پارلیمنٹ کے رُکن اور انڈی پنڈنٹ لیبر پارٹی کے لیڈر کیر ہارڈی نے ہندوستان جانے اور وہاں ہندوستانیوں سے نہایت ابتدائی قسم کے جمہوری مطالبات پر گفتگو کرنے کی گستاخی کی تو سبھی برطانوی بورژوا اخباروں نے اس ''باغی'' کے خلاف خوب شور مچایا اور اب برطانیہ کے انتہائی بااثر اخباران ''شر پسندوں'' سے سخت برہم ہیں جو ہندوستان کے امن وسکون کو پراگندہ کر رہے ہیں اور عدالت کی سزاؤں کا سواگت کر رہے ہیں اور ان انتظامی کارروائیوں کا بھی جو جمہوریت پسند مبلغین کے خلاف ــــ لیکن ہندوستان میں عوام سڑکوں پر نکل کر اپنے قلم کاروں اور سیاسی رہنماؤں کے حق میں نکلنے لگے ہیں..... اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برطانیہ کی ہندوستان میں برسوں کی لوٹ مار اور ایرانی اور ہندوستانی جمہوریت کے خلاف ''مہذب'' یورپ کی حالیہ کوششیں ایشیا کے لاکھوں کروڑوں محنت کشوں کو ظالموں کے خلاف جدوجہد میں فولاد کی مانند مضبوط بنا دیں گی اور وہ اس طرح فتح یاب ہوں گے جس طرح جاپان ہوا ہے۔ طبقاتی شعور رکھنے والے محنت کش طبقے کو اب ایشیا میں اپنا دوست اور رفیق مل گیا ہے اور اس کی تعداد روز بروز تیزی سے بڑھے گی'۔[۲۶]

حوالہ جات

۱۔ وی۔آئی۔لینن، Collected Works، جلد ۳۴ (ماسکو، ۱۹۷۴ء)، ص ۲۷

۲۔ ایضاً، جلد ۲۱، ص ص ۴۱-۳۴۰

۳۔ ایضاً، جلد ۲، ص ص ۷۷-۳۷۲

۴۔ امریکی سیاست دان جو ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۹ء تک امریکہ کا صدر رہا۔ ۱۸۹۸ء میں جب امریکہ نے اسپین سے لڑ کر کیوبا اور فلپائن پر قبضہ کرلیا تھا، اس جنگ میں روز ویلٹ نے اپنی جارحانہ سرگرمیوں کے باعث بہت شہرت پائی اور امریکی سامراج کی توسیعی حکمت عملی کا ترجمان بن گیا۔
۵۔ وی۔ آئی۔ لینن، بحوالہ سابقہ، جلد ۱۳، ص ص ۷۷۔۷۵
۶۔ ایضاً، جلد ۱۵، ص ص ۳۶۔۳۴۴
۷۔ ایضاً، جلد ۱۹، ص ۸۶
۸۔ رجنی پام دت، *India Today* (لاہور، ۱۹۷۹ء)، ص ۵۴۸
۹۔ وی۔ آئی۔ لینن، بحوالہ سابقہ، جلد ۲۲، ص ص ۶۰۔۲۵۹
۱۰۔ بپن چندرا، *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India* (نئی دہلی، ۱۹۷۷ء)، ص ص ۹۳۔۱۹۱ اور ۷۵۔۱۷۳
۱۱۔ وی لشسکی، بحوالہ سابقہ، ص ص ۸۷۔۱۸۶
۱۲۔ ایضاً، ص ص ۹۶۔۱۸۹
۱۳۔ آقا یحییٰ آرین پور، 'صبا تا نیما'، جلد اوّل (تہران)، ص ۸
۱۴۔ وی۔ آئی۔ لینن، بحوالہ سابقہ، جلد ۲۰، ص ۴۰۶
۱۵۔ ایضاً، جلد ۱۵، ص ص ۸۳۔۱۸۲
۱۶۔ ایضاً، جلد ۱۷، ص ص ۸۵۔۴۸۴
۱۷۔ *The Cambridge History of Islam*، بحوالہ سابقہ، جلد اوّل، ص ۳۶۸
۱۸۔ وی۔ آئی۔ لینن، بحوالہ سابقہ، جلد ۱۵، ص ۱۸۳
۱۹۔ ایضاً، ص ص ۲۱۔۲۲۰
۲۰۔ ایضاً، جلد ۱۸، ص ۳۳۷
۲۱۔ ایضاً، ص ص ۵۰۔۳۴۹
۲۲۔ ایضاً، ص ص ۵۴۔۳۵۳
۲۳۔ ایضاً، ص ص ۵۲۔۳۵۱
۲۴۔ ایضاً، جلد ۱۹، ص ۳۹
۲۵۔ ایضاً، ص ۸۶
۲۶۔ ایضاً، جلد ۱۵، ص ص ۸۵۔۱۸۳

دوسرا حصّہ

متفرق مضامین

اس حصے میں شامل ابتدائی چار مضامین یعنی 'کارل مارکس' (مارکس کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ)، 'سوشلزم کے زرّیں اصول' (بابت: مولوی برکت اللہ)، 'سوشلزم اکثریت کی فلاح کا ضامن ہے' (بابت: مولانا عبید اللہ سندھی) اور 'میں کمیونسٹ ہوں' (بابت: مولانا حسرت موہانی) سبطِ حسن صاحب کے مرتب کردہ کتابچے 'کارل مارکس' سے لیے گئے ہیں۔ یہ کتابچہ ۱۹۸۳ء میں کارل مارکس صدی کی تقریبات کے موقع پر شائع ہوا تھا۔ اس حصے کے بقیہ مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوئے جن کا حوالہ ہر مضمون کے ساتھ اس کے پہلے صفحے پر درج کر دیا گیا ہے۔

کارل مارکس

یورپ نے انیسویں صدی میں دو عظیم شخصیتیں پیدا کیں۔ ایک چارلس ڈارون، دوسرے کارل مارکس۔ ڈارون نے نباتات اور حیوانات کے ارتقا کا قانون (قدرتی انتخاب اور بقائے اصلح کا قانون) دریافت کیا اور مارکس نے انسانی تاریخ کے ارتقا کا قانون۔ ڈارون کی دریافتوں نے سائنسی دنیا میں انقلاب برپا کردیا جبکہ مارکس کی دریافتوں نے سماجی انقلاب کی راہیں روشن کیں۔ اُس وقت تک یہ سیدھی سادی بات لوگوں کی نظر سے اوجھل تھی کہ سیاست، سائنس اور آرٹ وغیرہ کی خدمت کرنے سے پہلے انسان کو پینے کے لیے پانی، پیٹ بھرنے کے لیے غذا، تن ڈھانکنے کے لیے پوشاک اور سر چھپانے کے لیے گھر درکار ہوتا ہے۔ ان ضروریاتِ زندگی کو حاصل کرنے کی خاطر وہ آلات واوزار بناتا ہے اور دوسرے انسانوں سے رشتہ جوڑنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ پیداواری رشتے جغرافیائی ماحول اور آلاتِ پیداوار کی نوعیت سے متعین ہوتے ہیں۔ معاشرہ ان کو اپنی ضرورت کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ طریقۂ پیداوار اور پیداواری رشتوں میں تبدیلیاں ہی سماجی انقلاب کا سبب ہوتی ہیں۔ مارکس نے انہی نظریوں کی مدد سے سرمایہ داری نظام کو جانچا، پرکھا اور اس کے بطن سے نئے نظام کا جو آفتاب طلوع ہونے والا تھا اس کی نشان دہی کردی۔

کارل مارکس ۵ مئی ۱۸۱۸ء کو جرمنی کے شہر ٹرائر میں پیدا ہوا جو دریائے رہائن کی باجگزار موزیل ندی کے کنارے واقع ہے۔ اس کا خاندان یہودی تھا اور کئی پشتوں سے ٹرائر میں آباد تھا۔ مارکس کے باپ ہائن رِخ مارکس نے جو ایک خوش حال وکیل تھا کارل مارکس کی ولادت سے کئی برس پہلے آبائی مذہب ترک کرکے عیسائی مذہب اختیار کرلیا تھا۔ وہ فرانس کی انقلابی تحریکوں سے

بہت متاثر تھا چنانچہ اس کے کتب خانے میں والٹیئر، رُوسو، دیدرو، لائب نز اور دوسرے روشن خیال مفکروں کی بے شمار کتابیں موجود تھیں۔ گھر کا یہ ماحول کارل مارکس کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔

مارکس کی ابتدائی تعلیم مقامی اسکول میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نپولین کی شکست کے بعد یورپ بالخصوص جرمنی میں جبر واستبداد کا دور دورہ تھا۔ شہری آزادی سرے سے مفقود تھی جس کی وجہ سے لوگوں میں سخت بے چینی پھیلی ہوئی تھی حتیٰ کہ مارکس کے اسکول میں بھی حکومت کے مخالفوں کی کمی نہ تھی۔ ایک بار پولیس نے چھاپہ مارا تو بہت سا ممنوعہ لٹریچر برآمد ہوا اور ایسی نظمیں بھی ملیں جن میں حکاّم پر خوب خوب پھبتیاں کسی گئی تھیں۔

کارل مارکس نے ۱۸۳۵ء میں اسکول سے رخصت ہوتے وقت جو الوداعی مضمون پیش کیا تھا اس سے نوجوان طالب علم کے ذہنی رجحانات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ مضمون کا عنوان تھا 'پیشے کا انتخاب' اور مارکس نے لکھا تھا کہ:

> 'پیشے کا انتخاب کرتے وقت ہم کو بنی نوعِ انسان کی بھلائی کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔ اگر ہم کوئی ایسا پیشہ اختیار کریں جس میں ہم کو انسانوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کا موقع مل سکے تو ہماری کمر بھاری سے بھاری بوجھ سے بھی نہ جُھک سکے گی۔'

اُسی سال مارکس بون یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ اُس کے خاص مضامین قانون اور فلسفہ تھے۔ اسی اثنا میں اُس کی منگنی بچپن کی ہم جولی اور بڑی بہن صوفیہ کی سہیلی جینی سے ہو گئی۔ جینی شہر کی سب سے حسین دوشیزہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کا باپ لُڈ ویگ فان ویسٹ فالین خاندانی نواب تھا اور ٹرائر میں ایک بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ جینی کی ماں سکاٹ لینڈ کی نواب زادی تھی۔ کارل مارکس اور جینی کے والدین پڑوسی تھے اور ان کے تعلقات بھی بڑے دوستانہ تھے۔ جینی کا باپ عام نوابوں کے برعکس نہایت روشن خیال تھا چنانچہ کارل مارکس کو سب سے پہلے اسی نے فرانس کے خیالی سوشلسٹ سینٹ سائمن کے نظریات سے روشناس کرایا تھا۔ مارکس اس کی بڑی عزت کرتا تھا یہاں تک کہ اُس نے اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کو لُڈ ویگ فان ویسٹ فالین ہی کے نام معنون کیا۔ منگنی ہو گئی مگر شرط یہ تھی کہ مارکس یونیورسٹی میں جی لگا کر پڑھے گا اور جینی سے

ایک سال تک نہیں ملے گا۔

مارکس نے ایک سال بون میں گزارا پھر باپ کی ہدایت پر برلن یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ برلن میں اس نے شاعری بھی شروع کر دی اور جب محبوبہ کی یاد بہت زیادہ ستاتی تو شعر لکھنے بیٹھ جاتا۔ اُس نے ایک سال کے اندر نظموں کی تین بیاضیں 'اپنی پیاری دلنواز جینی' کی نذر کیں۔ اس نے ڈرامہ اور ناول لکھنے کی بھی کوشش کی مگر جلد ہی اس کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اس میدان کا مرد نہیں ہے۔

برلن میں اُن دنوں جرمن فلسفی ہیگل (۱۷۷۰ء۔۱۸۳۱ء) کا طوطی بول رہا تھا اور جس طرح ان دنوں اقتدار پرست حضرات علامہ اقبالؔ کی شاعری کو اپنے مقصد کی خاطر استعمال کر رہے ہیں اور اُن کے ترقی پسند افکار پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں اُسی طرح جرمنی کے سرکاری حلقے بھی ہیگل کے مُرید بن گئے تھے اور اس کی تحریروں سے جرمن ریاست کے جبر و استبداد کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے البتہ وہاں نوجوان فلسفیوں کا ایک حلقہ بھی تھا جو ہیگل کے فلسفے کے ترقی پسندانہ پہلو پر زور دیتا تھا اور بشر کے تحصیلِ ذات اور اصلاحِ معاشرہ کے نظریئے اخذ کرتا تھا۔ ان نوجوان مفکروں نے برلن یونیورسٹی میں 'ڈاکٹر کلب' کے نام سے اپنی ایک چھوٹی سی تنظیم بنا رکھی تھی مارکس بھی اس کلب میں شامل ہو گیا۔

مارکس کے باپ کی خواہش تھی کہ بیٹا وکیل بنے اور نام پیدا کرے مگر مارکس کا رجحان فلسفے کی طرف تھا۔ ہائن ریخ مارکس کی وفات کے بعد مارکس نے قانون کو خیر باد کہا اور فلسفے کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ۱۸۴۱ء میں اس نے جینا یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی (ڈاکٹری) کی ڈگری حاصل کر لی۔ اُس نے اپنے مقالے میں قدیم یونان کے مادّی فلسفی دیمقراطیس اور ابیقورس کے ایٹمی نظریوں کا موازنہ پیش کیا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر مارکس نے بون یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ میں ملازمت کی کوشش کی مگر ناکام رہا تب اُس نے صحافت کا رُخ اختیار کیا اور 'رہائی نش زائی تو نگ' نامی اخبار سے وابستہ ہو گیا۔ اس اخبار کے مالک علاقہ رہائن کے چند ریڈیکل سرمایہ دار تھے جن کا رابطہ 'ڈاکٹر کلب' کے دانش وروں سے بھی تھا۔ اکتوبر ۱۸۴۲ء میں مارکس اس اخبار کا چیف ایڈیٹر مقرر ہو گیا۔

مارکس کی ادارت میں 'رہائی نش زائی تو نگ' کی اشاعت چند ہفتوں میں تین گنا بڑھ گئی۔

مارکس نے کسانوں کے حقوق اور پریس کی آزادی کی حمایت میں مسلسل کئی مضامین لکھے جن کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ وہ تحریر کی آزادی کو ہر فردِ بشر کا شہری حق ہی نہیں سمجھتا تھا بلکہ انسان کی شخصیت کی نشوونما کی بنیادی شرط خیال کرتا تھا۔ سنسر شپ کی مخالفت کرتے ہوئے اس نے لکھا تھا کہ:

'سنسر شپ انسانی سرشت کی نفی ہے۔ سنسر شپ پریس کو یہ باور کروانا چاہتی ہے کہ تم بیمار ہو اور حکومت تمہاری طبیب ہے مگر یہ طبیب وہ دیہاتی جراح ہے جس کے پاس ایک ہی آلہ ہے اور وہ ہے قینچی۔ یہ عطائی جراح انسان کے بدن کا ہر وہ حصہ کاٹ کر پھینک دیتا ہے جو اس کو بُرا لگتا ہے۔'

البتہ مارکس کے نزدیک اس صورتِ حال کے ذمے دار اخباروں کے مالک بھی تھے جنہوں نے صحافت کو مقدس مشن یا قومی فریضے کی بجائے تجارت بنا دیا ہے۔

مارکس کی تحریریں دو دھاری تلوار تھیں جس کی ضرب جرمنی کے فیوڈل نظام اور استبدادی حکومت دونوں پر پڑتی تھی۔ لہٰذا حکومت نے سنسر شپ کی پابندیاں اتنی سخت کر دیں کہ مارکس جنوری ۱۸۴۳ء میں 'رہائی نش زائی تو نگ' سے مجبوراً الگ ہو گیا۔ جون میں اس کی شادی جین ویسٹ فالین سے ہو گئی اور وہ سُسرال چلا گیا وہیں اُس نے ہیگل کے 'فلسفۂ حق' پر تنقید لکھی۔ اس مقالے میں مارکس نے ہیگل کے اس دعوے کو رد کیا تھا کہ بورژوا ریاست بالخصوص جرمن ریاست انسانی ارتقا کا نقطۂ عروج ہے۔ مارکس نے اپنے مضمون میں اس عہدِ نو کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی کیا تھا جس کی رونمائی محنت کش طبقہ کرے گا اور پہلی بار بشر کی تخلیقی خصوصیت اور پرولتاریہ کے انقلابی منصب سے بھی بحث کی تھی۔

مارکس کے لیے اب جرمنی میں کام کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی لہٰذا اس نے اپنے پرانے دوست آرنلڈ رُوج کی دعوت پر نو بیاہتا دُلہن سمیت پیرس کی راہ لی۔ آرنلڈ رُوج پیرس سے جرمن زبان میں ایک نظریاتی رسالہ نکالنا چاہتا تھا۔ مارکس اس کے ساتھ شامل ہو گیا لیکن یہ پرچا ایک ہی اشاعت کے بعد بند ہو گیا۔ البتہ اسی پرچے کی بدولت مارکس کو فریڈرک اینگلز سے جس کا ایک مضمون آرنلڈ رُوج کے پرچے میں چھپا تھا، خط و کتابت کا موقع ملا۔ کچھ دنوں بعد جب اینگلز مانچسٹر سے جرمنی جاتے ہوئے پیرس میں ٹھہرا اور مارکس کا مہمان ہوا تو پتہ چلا کہ دونوں کے

خیالات بالکل یکساں ہیں۔ خیالات کی یہی ہم آہنگی ایک قابلِ رشک رفاقت کی بنیاد بنی جو مرتے دم تک قائم رہی۔

فریڈرک اینگلز ۱۸۲۰ء میں رہائن لینڈ کے شہر بارمین میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کا باپ دولت مند صنعت کار تھا جس نے بیٹے کو تعلیم کی تکمیل سے پہلے ہی کاروبار میں لگا دیا تھا مگر اینگلز کو کاروبار سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ طبعًا باغی تھا اور ہائنے اور شیلے کی نقل میں جوشیلی نظمیں لکھا کرتا تھا۔ اس کو فلسفہ اور اقتصادیات کا بھی بڑا شوق تھا اور جب باپ نے اس کو اپنی فیکٹری کی دیکھ بھال کے لیے مانچسٹر بھیج دیا تو اینگلز کو برطانوی مزدوروں کے حالات کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُس نے آرنلڈ رُوج کے رسالے کے لیے 'علمِ اقتصادیات کا تنقیدی جائزہ' کے عنوان سے جو مقالہ لکھا تھا اُس کے بارے میں مارکس نے علانیہ یہ اعتراف کیا کہ اینگلز ہی کے مضمون نے مجھ کو سرمایہ دارانہ نظام کی اقتصادیات کی جانب متوجہ کیا۔ اینگلز برطانیہ میں سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں سے بھی ملتا رہتا تھا اور ان کے پرچوں میں بھی لکھا کرتا تھا۔ پیرس میں مارکس کے ساتھ دس دن گزارنے کے بعد اینگلز مارکس کے علم و فضل کا ایسا گرویدہ ہوا کہ مارکس کی خاطر تمام عمر مالی اور قلمی قربانیاں کرتا رہا۔

اُن دنوں پیرس کے کوچہ و بازار انقلابی نعروں سے گونج رہے تھے۔ مارکس بھی شہر کے انقلابی حلقوں میں شامل ہو گیا اور زیادہ وقت علمِ اقتصادیات اور سیاسیات کے مطالعے میں خرچ کرنے لگا۔ اُس کا رابطہ اُن جرمن مزدوروں سے بھی تھا جو روزگار کے سلسلے میں پیرس میں مقیم تھے اور جرمنی کی خفیہ انقلابی تنظیموں سے وابستہ تھے۔ جرمن حکومت کو جب مارکس کی ان سرگرمیوں کی خبر ہوئی تو اُس نے فرانسیسی حکومت پر دباؤ ڈالا اور مارکس کو پیرس سے برسلز (بیلجیئم) منتقل ہونا پڑا (دسمبر ۱۸۴۵ء) اُس وقت وہ ایک بچی کا باپ بن چکا تھا۔ برسلز میں مارکس کو مقامی سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہ تھی البتہ تارکینِ وطن مزدوروں سے ملنے جلنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ وہیں رہ کر مارکس نے کئی کتابیں لکھیں۔ سوشلسٹ خیالات کی نشر و اشاعت شروع کی، مزدوروں کے کلب میں سوشلزم پر لیکچر دیئے اور اینگلز کے ہمراہ پہلی بار لندن کی کمیونسٹ لیگ کے جلسوں میں شریک ہوا۔ یہ وہی کمیونسٹ لیگ تھی جس کی ہدایت پر مارکس اور اینگلز نے 'کمیونسٹ مینی فیسٹو' لکھا۔

'کمیونسٹ مینی فیسٹو' مارکس اور اینگلز کی وہ انقلابی تصنیف ہے جس نے شائع ہوتے ہی دنیا

میں ہلچل مچادی اور ڈیڑھ سو سال گزرنے کے بعد بھی اس کی ہر دلعزیزی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ لینن کہا کرتا تھا کہ: 'یہ کتابچہ کتابوں سے بھرے ہوئے کئی کتب خانوں پر بھی بھاری ہے۔ اس کی روح آج بھی دنیا بھر کے محنت کشوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرتی اور ان کی رہنمائی کرتی ہے'۔ اسی لیے مینی فیسٹو کو 'محنت کشوں کی بائبل' بھی کہتے ہیں۔ مارکس اور اینگلز نے اس کتاب میں سائنسی سوشلزم کے بنیادی اصول اور اغراض و مقاصد بڑے مختصر لفظوں میں بیان کیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ معاشرہ ہزاروں برس سے معاشرتی جدوجہد کے ذریعے ترقی کے زینے طے کرتا چلا آرہا ہے۔ سرمایہ داری نظام بھی طبقاتی جدوجہد ہی سے ایک خاص وقت میں ظہور میں آیا۔ اُس نے بڑے تاریخی کارنامے سرانجام دیئے اور واضح کر دیا کہ: 'انسان اپنے عمل سے کیا کچھ نہیں کر سکتا'۔ مگر اب اس کے دن پورے ہو چکے ہیں کیونکہ ملوں، کارخانوں اور فیکٹریوں وغیرہ میں پیداواری عمل تو اشتراکی ہو گیا ہے لیکن پیداوار اور ذرائع پیداوار دونوں چند افراد کی ذاتی ملکیت ہیں۔ اس تضاد کی وجہ سے معاشرے میں اقتصادی بحران آتا رہتا ہے اور کروڑوں تندرست عورت اور مرد روزی روزگار سے محروم ہو جاتے ہیں۔ چیزوں کی فراوانی ہے لیکن یہ چیزیں عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ اس تضاد کو سرمایہ داری نظام حل نہیں کر سکتا کیونکہ یہ تضاد اس کی سرشت میں داخل ہے۔ لہٰذا محنت کش عوام کا تاریخی فریضہ ہے کہ وہ اس فرسودہ نظام کو جو انسان کی مزید ترقی کی راہ میں حائل ہے، انقلابی جدوجہد کے ذریعے ختم کر دیں اور ذرائع پیداوار کو بھی مشترکہ ملکیت بنا کر سلطانیٔ جمہور کا پرچم بلند کریں۔

کمیونسٹ مینی فیسٹو کی اشاعت کو ابھی چند دن گزرے تھے کہ یورپ میں ایک بار پھر انقلاب کا غلغلہ بلند ہوا۔ ابتداء پیرس سے ہوئی جہاں فروری ۱۸۴۸ء میں لوئی فلپے کی بادشاہت کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔ مارکس اور اینگلز اُن دنوں برسلز میں تھے۔ وہ پیرس جانے کی سوچ رہے تھے کہ پولیس ملک بدری کا پروانہ لے کر آدھمکی اور مارکس گرفتار ہو گیا۔ جینی شوہر کی خیریت پوچھنے تھانے گئی تو اس کو بھی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ دوسرے دن جب اس اندھا دھند تشدد پر شہر میں شور مچا تو مارکس کو پولیس کی نگرانی میں پیرس روانہ کر دیا گیا۔ وہ گھر کا سامان بھی ساتھ نہ لے جا سکا۔

مارکس اور اینگلز پیرس میں تھے کہ جرمنی میں بھی انقلاب آ گیا لہٰذا دونوں ساتھی کولون روانہ ہو گئے۔ اینگلز تو عوامی فوج میں شامل ہو کر لڑنے چلا گیا مگر مارکس نے کولون سے اپنا اخبار 'نیو رہائی

نش زائی تو نگ' کے نام سے جاری کیا اور انقلابی سرگرمیوں میں بھی شریک ہوتا رہا لیکن جرمن حکومت مارکس کی تحریروں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس پر بیک وقت ۲۳ مقدمے قائم کیے گئے مگر جرم ثابت نہیں ہوا تو مئی ۱۸۴۹ء میں اس کو ۲۴ گھنٹوں کے اندر جرمنی سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔ مارکس نے اخبار بند کیا، چھاپے خانے کو اونے پونے بیچ کر ملازمین کے واجبات ادا کیے، جینی کے جہیز کے چاندی کے برتن جو ایک بار برسلز میں بھی رہن رکھے جا چکے تھے دوبارہ رہن ہوئے اور مارکس بیوی اور تین بچوں سمیت پیرس واپس آ گیا مگر تین مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ حکومتِ فرانس کی جانب سے حکم صادر ہوا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر فرانس خالی کر دو۔ اس وقت مارکس کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ بیوی بچوں کو ساتھ لے جاتا۔ چار و ناچار جینی کو جو حاملہ تھی بچوں سمیت پیرس میں چھوڑا اور خود ۲۴ اگست ۱۸۴۹ء کو لندن کی راہ لی۔ مارکس اب کے لندن ایسا گیا کہ پھر وہیں کا ہو رہا۔

انقلابی سرگرمیوں کے ڈیڑھ دو سال جو مارکس اور اینگلز نے یورپ میں گزارے بڑے صبر آزما تھے۔ اُن کو فرانس اور جرمنی کے انقلابوں سے بڑی امیدیں تھیں لیکن یہ اُمیدیں پوری نہیں ہوئیں البتہ عوامی جدوجہد میں شریک ہو کر انہوں نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ انقلابی عمل اتنا ہی ضروری ہوتا ہے جتنا انقلابی نظریے وضع کرنا یا کتابیں لکھنا۔

مارکس اور جینی کو شادی کے بعد سکھ چین کا شاید ہی کوئی دن نصیب ہوا ہو لیکن لندن میں تو ان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ نہ آمدنی کا کوئی ذریعہ، نہ کوئی یار و مددگار۔ اینگلز بھی ان دنوں وہاں موجود نہ تھا جو اُن کی چارہ گری کرتا۔ اسی اثنا میں مارکس کے گھر چوتھا بچہ پیدا ہوا جس کی وجہ سے مصارف اور بڑھ گئے۔ فلیٹ کا کرایہ ادا نہ ہو سکا تو مالکہ نے اُن کو کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے جینی ۳۰ مئی ۱۸۵۰ء کو ایک خط میں لکھتی ہے کہ:

> 'سرکاری ملازم آئے اور انہوں نے ہمارے بستروں، چادروں، پہننے کے کپڑوں، حتیٰ کہ میرے دودھ پیتے بچے کے پالنے اور بچیوں کی گڑیوں کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا۔ اور وہ غریب کونے میں کھڑی آنسو بہاتی رہیں۔ پولیس نے ہمیں مشکل سے دو گھنٹے کی مہلت دی مگر تم یہ نہ سمجھنا کہ میں ان پریشانیوں سے گھبرا کر ہمت ہار دوں گی۔ میں جانتی ہوں کہ

ہماری کشمکش کچھ ہمارے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ مجھ کو اس بات کی دلی خوشی ہے کہ میرا پیارا شوہر میری زندگی کا سہارا میرے ساتھ ہے۔ اس بات سے البتہ دُکھ ہوتا ہے کہ ان پریشانیوں نے اس کو ایسے وقت میں آن گھیرا ہے جب اسے توانائی، سکون اور اعتماد کی سخت ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ جو دوسروں کی مدد کر کے دلی خوشی محسوس کرتا ہے ان دنوں کتنا بے بس ہے۔'

اس شام مارکس نے بھاگ دوڑ کر کے کہیں سے کرائے کی رقم حاصل کی تب گھر کا اثاثہ واگزاشت ہوا مگر اُس کو فوراً ہی فروخت کر دیا گیا تا کہ دوا فروش، نانبائی، قصاب وغیرہ کے قرضے ادا کیے جا سکیں۔ اس کے بعد مارکس سوہو کے نہایت گندے اور گنجان علاقے میں دو کمروں کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا اور چھ سال تک وہیں رہا۔ سامنے کا کمرہ بیٹھنے اور لکھنے پڑھنے کے کام آتا تھا اور عقب کے کمرے میں پورا خاندان سوتا تھا۔ اسی جگہ دو سال کے اندر مارکس کے دو بچے خوراک اور دوا علاج کی کمی کی وجہ سے وفات پا گئے۔ دوسرا بچہ مرا تو گھر میں دوا کے لیے بھی پیسے نہ تھے۔ ایک بار تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ مارکس کو اپنا کوٹ پتلون تک رہن رکھنا پڑا۔ 'میرے حالات نے اب یہ صورت اختیار کر لی ہے کہ میں گھر سے باہر بھی نہیں نکل سکتا کیونکہ میرے کپڑے رہن ہیں'۔ اس کے باوجود مارکس کے عزم واستقلال میں کوئی فرق نہ آیا اور نہ جینی نے کبھی بھولے سے شوہر کی مصروفیتوں پر ناک بھوں چڑھائی بلکہ ہر مشکل وقت میں اس کی ڈھارس بندھاتی رہی۔ اُس کا بھائی ان دنوں جرمنی کا وزیرِ داخلہ تھا۔ اس نے بہن کو لکھا کہ تم لوگ واپس آ جاؤ میں تمہاری کفالت کروں گا۔ غیور جینی نے جواب دیا کہ: 'میں نے مارکس اور اس کے خیالات سے شادی کی ہے۔ جرمنی میں ان دونوں کی گنجائش نہیں۔ مجھ کو ایسا جرمنی نہیں چاہیے۔'

گھریلو پریشانیوں کے باوجود مارکس اپنی دُھن میں لگا رہا۔ وہ صبح سویرے برٹش میوزیم چلا جاتا اور شام کے سات بجے گھر واپس لوٹتا پھر ڈیڑھ دو بجے رات تک کام کرتا رہتا۔ چنانچہ اپریل ۱۸۵۰ء اور اگست ۱۸۵۳ء کے درمیان اس نے اقتصادیات کی کتابوں اور سرکاری رپورٹوں سے ۲۴ بیاضیں بھر ڈالیں۔ اس دوران اینگلز بھی لندن پہنچ گیا اور ایک سال وہاں رہ کر دوبارہ مانچسٹر چلا گیا تا کہ مارکس کی تھوڑی بہت کفالت کر سکے۔

اگست ۱۸۵۱ء میں اخبار 'نیویارک ڈیلی ٹری بیون' کے ایڈیٹر چارلس ڈانا نے جو مارکس سے کولون میں مل چکا تھا مارکس کو اخبار کی نامہ نگاری پیش کی۔ شرط یہ تھی کہ مارکس ہفتے میں دو خبر نامے بھیجا کرے گا۔ ایسی حالت میں کہ یورپ میں انقلاب دشمن قوتوں کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اظہارِ رائے کی تمام راہیں مسدود تھیں مارکس نے اس پیشکش کو غنیمت جانا وہ تقریباً گیارہ برس تک نامہ نگاری کے فرائض ادا کرتا رہا البتہ امریکہ میں جب خانہ جنگی شروع ہوئی اور 'نیویارک ڈیلی ٹری بیون' نے غلامی کی حمایت کا رویہ اختیار کیا تو مارکس نے 'ٹری بیون' سے ناتا توڑ لیا۔

مارکس اور اینگلز نے 'ڈیلی ٹری بیون' میں یورپ کے حالاتِ حاضرہ کے علاوہ ترکی، مصر، ایران، ہندوستان اور چین کے بارے میں بے شمار مضامین لکھے اور مشرقی ملکوں میں مغربی حکومتوں کی ریشہ دوانیوں اور استحصالی سرگرمیوں کو خوب خوب بے نقاب کیا۔ اُنہوں نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ مشرق میں ہزاروں سال سے معاشرتی جمود کیوں ہے؟ اور ہندوستانی معاشرے میں وہ کیا خرابیاں تھیں جن کی وجہ سے یہاں یورپ کی مانند سرمایہ داری کو فروغ نہیں ہوا؟ اور نہ صنعتی انقلاب آیا بلکہ انگریز سوداگروں کی ایک مختصر سی جمعیت اس وسیع و عریض ملک پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ ان کے نزدیک معاشرتی جمود اور غلامی کے دو بنیادی اسباب تھے اوّل ریاستی استبدادیت، دوم دیہات کا خود کفیل زرعی اور دستکاری نظام۔

انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر کے یہاں کی صنعت و حرفت کو جس بے دردی سے برباد کیا اور ملک کو خام مال کی منڈی اور برطانوی مصنوعات کے بازار میں تبدیل کر دیا اس کی وضاحت کرتے ہوئے مارکس نے 'ٹری بیون' میں کئی مضامین لکھے بلکہ مارکس کا دعویٰ تھا کہ برطانیہ میں ۱۸ویں صدی میں سرمائے کا جو ارتکاز ہوا وہ بڑی حد تک ہندوستانی دولت کی براہِ راست اور بے تحاشا لوٹ سے ہوا مگر اس شر میں خیر کا جو پہلو پوشیدہ تھا مارکس اُس سے بے خبر نہ تھا۔ مارکس کا خیال تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں سرمایہ داری نظام نافذ کر کے ایک تاریخی فریضہ ادا کیا ہے۔ ہندوستان جو اب تک الگ تھلگ تھا عالمگیر سرمایہ دارانہ معیشت کا جز بن گیا ہے۔ اسی کے ساتھ تار برقی اور ریلوں کے جال 'مغربی طرز کی تربیت یافتہ دیسی فوج جس کو تشکیل دے کر انگریزوں نے ہندوستانیوں کے لیے دشمن سے مقابلے کا پہلا مرکز قائم کر دیا ہے۔' (یہ پیش گوئی ۱۸۵۷ء میں حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی) اس کے علاوہ چھاپے خانے اور اخبار جن سے ایشیائی

معاشرہ پہلی بار روشناس ہوا اور جو تعمیرِ نو کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوں گے' اور پھر انگریزی تعلیم اور مغربی طرز کے اسکول اور کالج جن کا مقصد یوں تو سرکاری دفتروں کے لیے بابو تیار کرنا ہے مگر جہاں پر' مغرب کے جدید علوم وفنون اور جمہوریت، آزادی اور خودمختاری کے اصول بھی پڑھائے جاتے ہیں' لیکن مارکس نے متنبہ کیا کہ:

'کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ انگریز صنعت کاروں کی ان سرگرمیوں کی بدولت ہندوستان خود بخود آزاد ہو جائے گا یا ہندوستان کے عوام کی حالت سندھر جائے گی۔ ہندوستانیوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ انگریزوں کے نافذ کردہ معاشرے کے نئے عناصر کا پھل اس وقت تک نہیں کھا سکیں گے جب تک برطانیہ میں موجود حاکم طبقے کی جگہ پرولتاریہ کا راج نہ ہو جائے یا خود ہندوستانی اتنے قوی نہ ہو جائیں کہ انگریزوں کی غلامی کا جوا اتار پھینکیں۔'

مارکس اور اینگلز کو ۱۸۵۷ء کی بغاوتِ ہند سے پوری ہمدردی تھی اور وہ اپنے خبرناموں میں بغاوت کی رُوداد مسلسل رقم کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے اس بات کا علانیہ اظہار کیا کہ:

'ہندوستان کی موجودہ شورش فوجی بغاوت نہیں بلکہ قومی انقلاب ہے۔ البتہ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کی جدوجہد ناکام ہو جائے گی کیونکہ ان کی مرکزی لیڈرشپ بے حد کمزور اور برائے نام ہے۔ ملک گیر پیمانے پر ان کی کوئی مشترکہ حکمتِ عملی نہیں ہے اُن میں ایکا بھی نہیں بلکہ وہ ایک دوسرے کے خلاف سازش کرتے رہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دفاعی جنگ لڑتے ہیں جس کی وجہ سے انگریزوں کو فوجی کمک منگوانے اور نقل وحرکت کی پوری آزادی حاصل ہے۔'

مارکس نے سرمایہ دارانہ معیشت کا مطالعہ ۱۸۴۳ء میں شروع کیا تھا۔ یہ سلسلہ ۲۴ برس تک جاری رہا۔ اس دوران میں مارکس نے فلسفہ، سیاسیات اور سرمایہ داری نظام پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کئی اہم کتابیں لکھیں۔ 'نیویارک ڈیلی ٹری بیون' کی نامہ نگاری کی اور مزدوروں کی انقلابی سرگرمیوں میں بھی شریک ہوتا رہا لیکن اس کی زندگی بھر کی کاوش وتحقیق کا حاصل کتاب 'سرمایہ' ہے

جس کی خاطر مارکس نے اپنی صحت، مسرت اور گھریلو زندگی ہر چیز قربان کردی۔ 'سرمایہ' کی پہلی جلد ستمبر ۱۸۶۷ء میں جرمن زبان میں شائع ہوئی اور جلد ہی فرانسیسی، روسی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ کرلی گئی۔ البتہ بقیہ جلدیں مارکس کی زندگی میں نہ چھپ سکیں بلکہ اینگلز نے مارکس کی وفات کے بعد اس کے مسوّدوں کو مرتب کرکے شائع کیا۔

اس کتاب کا مقصد مارکس کے بقول 'جدید معاشرے (سرمایہ داری نظام) کے اقتصادی قانونِ حرکت کی تشریح کرنا تھا' لیکن مارکس کی جان لیوا محنت کا یہ شاہکار سرمایہ داری نظام کی تشریح ہی نہیں بلکہ فردِ جرم بھی ہے جس میں سرمایہ داری نظام کے استحصالی طریقوں کی اصلیت آشکار کی گئی ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ سرمایہ داری نظام میں ہر چیز بازار میں فروخت ہونے کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ یہ سب چیزیں محنت کشوں کی محنت سے پیدا ہوتی ہیں لہٰذا ان میں قدرِ مشترک انسانی محنت ہوتی ہے۔ محنت کاروں کو بازار کے بھاؤ سے کام کی جو اجرت ملتی ہے اُس کے عوض وہ مقررہ وقت میں کئی گنا مالیت کا سامان تیار کردیتے ہیں لیکن اس فاضل محنت اور فاضل پیداوار کا ان کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ یہی قدرِ فاضل، صنعت کار کے نفع، ساہوکار کے سود اور زمین کے مالک کے لگان اور کرائے کی شکل میں سرمایہ دار طبقے میں بٹ جاتی ہے۔ سرمایہ داروں کے حمایتی سو سال سے مارکس کے دعووں کی تردید میں لگے ہوئے ہیں لیکن مارکس نے سرمایہ داری کے استحصالی نظام کا جو تجزیہ کیا وہ ہر محنت کار کی آپ بیتی ہے، اُس کا روزانہ کا تجربہ ہے جس کو بے سروپا دلیلوں سے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

جس وقت 'سرمایہ' کی پہلی جلد شائع ہوئی تو مارکس کی عمر پچاس سے بھی کم تھی۔ وہ گٹھے بدن کا مضبوط آدمی تھا اور روزانہ سترہ اٹھارہ گھنٹے کام کرکے بھی نہ تھکتا تھا مگر جلاوطنی کی زندگی اور آلام ومصائب نے اس کو وقت سے پہلے بوڑھا کردیا تھا۔ اُس کو دو وقت کی روٹی کبھی سکون سے نہ ملی اس کے باوجود اُس نے اپنے اصولوں پر کبھی حرف نہ آنے دیا۔ اس ظالمانہ انسان دشمن سماجی نظام کو بدل کر سوشلزم کے منصفانہ نظام کو قائم کرنے کا عزم وولولہ کبھی دھیما نہیں ہوا لیکن جسم آخر جسم ہے وہ ان جفاکشیوں کو کب تک برداشت کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی صحت تیزی سے گرنے لگی اور بیماریوں نے آن گھیرا۔ ایک روز تو وہ برٹش میوزیم میں پڑھتے پڑھتے بے ہوش ہوگیا اور سینے میں اتنا شدید درد اُٹھا کہ سانس لینا دوبھر ہوگیا۔

اسی اثنا میں فرانس اور جرمنی میں جنگ چھڑ گئی (۱۸۷۰ء) فرانس کو شکست ہوئی اور شہنشاہ نپولین بونا پارٹ سوئم قید کر لیا گیا۔ تب پیرس کے شہری اپنی غدار اور نااہل حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور پیرس میں اپنی پنچایتی حکومت قائم کر لی (مارچ ۱۸۷۱ء) جو پیرس کمیون کے نام سے مشہور ہے۔ یہ حکومت تین ماہ بعد بڑی بے رحمی سے ختم کر دی گئی۔ ہزاروں مزدوروں نے پھانسی پائی اور جلاوطن ہوئے۔ پیرس کے نہتے مزدوروں پر ہولناک مظالم توڑے گئے مارکس نے ان کو شدت سے محسوس کیا۔ اُس نے فوراً ہی ایک کتاب لکھی تاکہ مہذب دنیا کو فرانسیسی خانہ جنگی کی اصل حقیقت معلوم ہو جائے اور فرانسیسی پناہ گزینوں کی امداد میں مصروف ہو گیا۔ اس دوڑ بھاگ کا اس کی صحت پر بہت خراب اثر پڑا۔ جگر کی خرابی کا پرانا مرض پھر سے تکلیف دینے لگا اور اس پر بے خوابی اور درد سر کے دورے پڑنے لگے۔

ابھی اس کی طبیعت سنبھلی نہ تھی کہ جینی سخت بیمار پڑ گئی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ جگر کا کینسر ہے۔ مارکس نے دن رات خدمت کی مگر جینی کی حالت نہ سنبھلی اور دسمبر ۱۸۸۱ء میں جینی کا انتقال ہو گیا۔ محبت کی یہ شمع فروزاں کیا بجھی کہ مارکس کی زندگی تاریک ہو گئی۔ ابھی یہ غم تازہ تھا کہ بڑی بیٹی جو پیرس میں بیاہی تھی اچانک چل بسی۔ اس حادثے نے مارکس کی رہی سہی قوت مدافعت بھی چھین لی۔ اُس کو پلورسی ہو گئی اور پھیپھڑوں نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا۔ آخر ۱۴ مارچ ۱۸۸۳ء کو وہ انقلابی جس نے سب کو جگانے کا عزم کر رکھا تھا کرسی پر آرام کرتے کرتے ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ اُس کو ہائی گیٹ کے قبرستان میں جینی کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

جس وقت مارکس نے وفات پائی تو دو ہی گز زمین اس کی ملکیت تھی جس میں وہ دفن ہوا۔ مگر آج ایک تہائی دنیا میں اس کے انقلابی اصولوں پر عمل ہو رہا ہے۔ وہاں کے محنت کش آج نئی دنیا اور نیا آدم بنانے میں لگے ہیں ایسی دنیا جس میں کوئی کسی کا غلام نہیں ہے نہ کوئی کسی کی محنت کا پھل کھاتا ہے۔ ایسی دنیا جس میں محنت کشوں کا راج ہے اور سرمایہ دار اور جاگیردار مفقود ہیں۔ بے روزگاری مفقود ہے۔ کسی کو روزی روزگار کی فکر نہیں ستاتی اور بقیہ دنیا میں بھی اس وقت ایسا کوئی ملک نہیں جس میں مارکس کے ہزاروں بلکہ لاکھوں پیرو آزادی، امن، جمہوریت اور سماجی انصاف کی خاطر جدوجہد میں مصروف نہ ہوں۔ اینگلز نے مارکس کے جنازے پر تقریر کرتے ہوئے سچ کہا تھا کہ مارکس کا نام سدا زندہ رہے گا اور اُس کا کام بھی۔

'سوشلزم کے زرّیں اصول'

مولوی برکت اللہ

(۱۸۵۹ء۔۱۹۲۷ء)

مولوی برکت اللہ بھوپالی ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے زبردست علمبردار تھے۔ اُنہوں نے برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کے سلسلے میں برطانیہ، یورپ، جاپان اور امریکہ کے علاوہ سویت یونین کا دورہ بھی کیا تھا۔ وہ اُن چند علماء اسلام میں سے تھے جو انقلاب روس کے کچھ عرصے بعد ہی مئی ۱۹۱۹ء میں ماسکو تشریف لے گئے، وہاں کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے اور لینن اور دوسرے بالشویک رہنماؤں سے ملاقات کی۔ ماسکو میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے اخبار 'اِزوِستیا' کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ:

> 'میں کمیونسٹ یا سوشلسٹ نہیں ہوں لیکن اس وقت میرے سیاسی پروگرام میں ایشیا سے انگریزوں کو بے دخل کرنا ہے۔ میں ایشیا میں یورپی سرمایہ داری کا سخت دشمن ہوں۔ چنانچہ ان مقاصد پر میرے اور کمیونسٹوں کے درمیان مکمل مفاہمت موجود ہے اور اس میدان میں ہم ایک دوسرے کے اتحادی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ آئندہ حالات کیا صورت اختیار کریں لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ روس کی سویت حکومت کی اُس مشہور اپیل نے جس میں تمام قوموں کے لوگوں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اُٹھ کھڑے ہوں اور سرمایہ داروں کے خلاف جہاد کریں، ہم لوگوں کو بہت متاثر کیا ہے اور ہم کو اس سے زیادہ یہ بات پسند آئی ہے کہ سویت یونین

نے (زارروس اور برطانیہ کے) ان تمام خفیہ معاہدوں کو طشت از بام کر دیا
جن کا مقصد دوسری قوموں بالخصوص اقوامِ مشرق کو غلام بنائے رکھنا تھا۔
نہ صرف یہ بلکہ سویت یونین نے ایسے تمام معاہدوں کو یکطرفہ طور پر منسوخ
کر دیا۔ روس تمام چھوٹی اور بڑی قوموں کے مابین برابری اور مساوات
کے اُصول کو تسلیم کرتا ہے۔ بالشویکوں کے افکار جن کو ہم اشتراکیت کہتے
ہیں ہندوستانی عوام الناس کے دلوں میں بھی گھر کرتے جا رہے ہیں۔'

اپنی کتاب 'بالشوزم اور اسلامی اقوام' میں مولوی برکت اللہ لکھتے ہیں کہ:

'مارکس کے افکار اور الہامی مذاہب کی اصل روح ایک ہے۔ دونوں کا
مقصد مظلوم، مقہور بندگانِ خدا کو ظلم و استبداد سے نجات دلا کر ایک آبرو
مندانہ اور پُرسکون زندگی مہیا کرنا ہے۔'

وہ لکھتے ہیں کہ:

'حکیم افلاطون نے اپنی مثالی جمہوریہ میں ایسا نقشہ پیش کیا ہے جس میں
ملکیت مشترک اور عوامی ہوگی۔ ضروریاتِ زندگی کی فراہمی، تفریح کے
ذرائع، معاش کے مواقع سب کے لیے مساوی ہوں گے۔ تعلیم کی ترقی
کے سبب قوم کا ہر فرد اس طرح علم سے بہرہ ور ہوگا کہ اس کا ہر عمل معقول
اور درست ہوگا۔ یہی وہ بنیادی اصول ہیں جن کی اساس پر کارل مارکس
نے انیسویں صدی میں سوشلزم کا پُرشکوہ ڈھانچہ پیش کیا تھا جس کے پیچھے
کئی نسلوں کا علم و تجربہ شامل تھا۔'

مولوی صاحب کو اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ ان کے زمانے میں ایک بھی مسلمان مملکت
ایسی نہیں جسے صحیح معنوں میں آزاد کہا جا سکے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

'آج ایک بھی آزاد مسلمان ریاست باقی نہیں اس لیے کہ بیسویں صدی
میں مسلمان ممالک برطانوی سامراج اور مطلق العنان زارشاہی، فرانسیسی
یا اطالوی استعمار کے ہاتھوں مغلوب ہو چکے ہیں۔ ان کا پوری طرح
استحصال کیا جا رہا ہے۔'

لیکن اس صورتِ حال سے مولوی صاحب نااُمید نہیں۔ فرماتے ہیں:

'مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ زار شاہی کی جبر و استبداد کی سیاہ رات کے بعد روس کے اُفق پر انسانی آزادی کی صبح طلوع ہو چکی ہے جس میں لینن ایک آفتاب کے مانند اپنے افکار کی ضیا پاشی سے لوگوں کو انسانی خوشحالی کی نوید دے رہا ہے۔ وہ شاندار اسکیم جسے اب سے دو ہزار برس قبل حکیم افلاطون نے پیش کیا تھا، جو ایک عظیم ورثہ کے طور پر ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہی، آج اس مثالی جمہوریہ کے اصول و نظریات کو عملی شکل دی جارہی ہے۔ لینن کی قیادت میں یہ ایک حقیقت بن کر قبولِ عام حاصل کرتی جارہی ہے۔ روس کے طول و عرض اور ترکستان میں سارا انتظام و انصرام محنت کشوں، زراعت پیشہ لوگوں اور عام سپاہیوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ تمام طبقوں اور قوموں کے مساوی حقوق تسلیم کر لیے گئے ہیں، ہر فرد کو بہتر زندگی کی ضمانت دی گئی ہے'۔

مولوی صاحب نے نہ صرف روس کی بالشویک حکومت کی مکمل تائید کی بلکہ روس کے لوگوں بالخصوص مشرقی علاقے کے مسلمانوں سے پُر زور اپیل کی کہ وہ صدقِ دل سے سویت حکومت کی حمایت کریں اور اس کے دشمنوں کے خلاف صف آرا ہو جائیں تاکہ انقلاب کی کامیابیوں کا تحفظ کیا جاسکے۔ اور سامراجیوں کی مداخلت اور ریشہ دوانیوں کا سدِّباب ہو۔ فرماتے ہیں کہ:

'اب وقت آگیا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان اور ایشیائی قومیں روسی سوشلزم کے بارے میں مکمل جانکاری حاصل کریں، اُن زرّیں اصولوں کو سمجھیں اور پورے جذبہ اور خلوص کے ساتھ انہیں قبول کریں۔ اس جدید نظام کی اساس میں جو نیک اور ارفع مقاصد پوشیدہ ہیں وہ اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ مسلمان اس کی مکمل تائید اور حمایت کریں۔ انہیں چاہیے کہ بالشویک فوجوں کے ساتھ مل کر برطانوی حواریوں اور دوسرے غاصب حکمرانوں کی جارحیت کو ناکام بنائیں۔ کوئی وقت ضائع کیے بغیر اپنے بچوں کو روسی اسکولوں میں بھیجیں تاکہ وہ جدید سائنس، اعلیٰ فنون، عملی

طبیعات، کیمیا اور میکانکی تکنیک حاصل کر سکیں۔'

انہوں نے مسلمانوں کو آواز دی کہ: 'اے مسلمانو! حق کی اس آواز کو سنو، کامریڈ لینن اور سویت حکومت، آزادی، مساوات اور اخوت کا جو پیغام دے رہے ہیں اس پر لبیک کہو۔'

مولوی برکت اللہ کی پوری زندگی ایک مجاہد کی زندگی تھی۔ اُن کا انتقال ۱۹۲۷ء میں امریکہ میں ہوا۔

'سوشلزم اکثریت کی فلاح کی ضامن ہے'

مولانا عبید اللہ سندھی

۱۸۷۲ء۔۱۹۴۴ء

آزادیٔ وطن کے مشہور مجاہد اور عالمِ دین مولانا عبید اللہ سندھی اپنے اُستاد شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی ہدایت پر ۱۹۱۵ء میں افغانستان تشریف لے گئے تھے۔ وہ سات سال کابل میں مقیم رہے اور وہاں کے حالات سے مایوس ہو کر اکتوبر ۱۹۲۲ء میں اپنے کئی ساتھیوں سمیت ماسکو چلے گئے۔ ماسکو کے دورانِ قیام میں اُنہوں نے کمیونزم کے اصول اور سوویت یونین میں ان اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کی جو کوششیں ہو رہی تھیں ان کا بغور مطالعہ کیا۔ نو ماہ بعد جب وہ استنبول پہنچے تو اُنہوں نے آزاد ہندوستان کے لیے آئین کا ایک خاکہ ۱۹۲۴ء میں استنبول سے اُردو میں شائع کیا جو سوویت آئین سے بہت ملتا جلتا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی سوشلسٹ تعلیمات کو اسلام کے عین مطابق سمجھتے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں وطن واپس آکر بھی وہ ان خیالات کا برابر اظہار کرتے رہے۔ 'آئین' کی تمہید میں ماسکو کے تاثرات بیان کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ:

> 'ہمیں ماسکو میں انقلابِ روس کے نتائج آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انقلاب کا مطالعہ کرنے کے لیے ہماری کمیٹی کے بعض ممبروں نے روسی زبان سیکھی۔ ہمیں روس کے اہم اشخاص سے تبادلۂ خیالات کے اچھے موقع ملے۔ یورپ کے دیگر ممالک پر جو انقلابِ روس کا اثر آیا اُس کے مطالعے کے لیے ہماری کمیٹی کے ممبران اُن ملکوں میں گئے...... (مگر) ہمیں افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی

موجودہ نسل انقلاب کی ماہیت سمجھنے سے بہت دُور ہوگئی ہے۔'

ہندوستان کے قومی مسائل سے بحث کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ:

'ہر ایک قوم میں طبقاتی پیچیدگی موجود ہے۔ مالدار اور محنت کش، زمیندار اور کسان، سرمایہ دار اور مزدور کی باہمی کشمکش ہر ایک ہندوستانی قوم کو دو متقابل اور متعارض صفوں میں بہ آسانی تقسیم کرسکتی ہے۔ اس لیے صرف مذہبی بنا پر تمام ہندوستانی مسائل اور خصوصاً ہندو مسلم اختلافات کو حل کرنا کوئی پائیدار راہِ نجات پیدا نہیں کرسکتا۔ لہٰذا ہم اپنے پروگرام میں مذہب کو ان مسائل کے حل کرنے کی اساس نہیں قرار دیتے بلکہ قومی اور طبقاتی تفریق اور اقتصادی و سیاسی اُصول پر ان مشکلات کا حل پیش کرتے ہیں۔'

مولانا سندھی سرمایہ داری نظام کے سخت مخالف تھے چنانچہ اس دستاویز میں ہندوستان کے مستقبل سے بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

'ہم اپنے ملک کے موجودہ نظامِ سرمایہ داری کو توڑ کر ایسے نظام کی بنیاد ڈالتے ہیں جو طبقہ محنت کش یعنی ملک کی اکثریت کی فلاح کا ضامن ہو اور اس محنت کش طبقے کے زیرِ اقتدار رہے۔ اس سے ہماری تحریکِ آزادی بھی یقیناً کامیاب ہوسکتی ہے۔'

سویت روس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ:

'ہندوستان نے انقلابِ فرانس سے چشم پوشی کرکے اپنی عظمت کو خاک میں ملا دیا۔ اب اس عالمگیر اہمیت رکھنے والے انقلاب (انقلابِ روس) سے اغماض کرکے ہم نہیں چاہتے کہ وہ اپنی موت کے پروانے پر دستخط کردے۔ ہمالیہ، قراقرم اور ہندوکش کے مقامِ اتصال سے چند قدم آگے روس ہم سے ملتا ہے۔ ہماری قطعی رائے ہے کہ اس غلامی کے ساٹھ سال میں جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے اگر وہ سارے کا سارا دے دیں اور ننگے بھوکے رہ کر بھی شمالی درّوں سے قطب شمالی تک رہنے والی قوموں کی دوستی خرید لیں تو ہم خسارے میں نہیں رہیں گے۔'

۱ رسالہ 'تاریخ وسیاسیات'، فروری ۱۹۵۴ء۔ انجمن ترقی اُردو، کراچی

'میں کمیونسٹ ہوں'

مولانا حسرتؔ موہانی

۱۸۷۵ء۔۱۹۵۱ء

مولانا حسرتؔ موہانی ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے بانیوں میں سے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں انہوں نے کانپور میں پارٹی کے پہلے دفتر کا افتتاح کیا اور سُرخ جھنڈا لہرایا۔ ۲۵۔۲۶ دسمبر ۱۹۲۵ء کو کانپور میں جب کمیونسٹوں کی پہلی کُل ہند کانفرنس منعقد ہوئی تو مولانا حسرتؔ موہانی مجلسِ استقبالیہ کے صدر تھے، اُن کے خطبۂ استقبالیہ کے اقتباسات درج ذیل ہیں اس خطبے میں انہوں نے آزاد ہندوستان کے لیے سوویت طرز کا آئین وضع کرنے کی تجویز پیش کی تھی:

'کمیونزم کی تحریک کسانوں اور مزدوروں کی تحریک ہے۔ ہندوستانی عوام عام طور پر اس تحریک کے اصولوں اور اغراض ومقاصد سے اتفاق کرتے ہیں لیکن بعض غلط فہمیوں کی بنا پر کچھ کمزور دل اور جلد گھبرا جانے والے افراد کمیونزم کے نام سے ڈر جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط فہمیاں سرمایہ دار اور اسی قسم کے دوسرے لوگ جو کمیونزم کے مخالف ہیں جان بوجھ کر پھیلاتے ہیں مثلاً کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ کمیونزم ہم کو لازمی طور سے کشت وخون اور دہشت گردی کی طرف لے جائے گا۔ اس غلط خیال کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ ہم عدم تشدد کو موقع کی ضرورت جان کر قبول کرتے ہیں اور مہاتما گاندھی کی طرح اس کو کوئی ابدی اور جامد اصول تسلیم نہیں کرتے۔

اسی طرح کچھ لوگ یہ بے بنیاد الزام لگاتے ہیں کہ کمیونزم اور ''تیرا بھی میرا'' کا مسلک ایک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ملکیت کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں یعنی ذاتی ملکیت میں جیسے گھڑی، چھتری، برتن، غذا، کپڑے بستر وغیرہ اور نجی ملکیت میں جیسے زمین، فیکٹریاں وغیرہ۔ کمیونسٹ اصول صرف نجی ملکیت پر لاگو ہوتا ہے ذاتی ملکیت پر نہیں لاگو ہوتا۔'

ہماری پارٹی کا تفصیلی پروگرام جو سویت آئین سے ملتا جلتا ہے اس کانفرنس میں غور وخوض اور منظوری کے لیے پیش کیا جائے گا۔ ہمارے اغراض ومقاصد یہ ہیں:

ا۔ تمام مناسب طریقوں سے سوراج یا مکمل آزادی حاصل کرنا۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہم کو یہ دیکھنا ہوگا کہ کمیونزم کے وہ تمام اصول جو سویت ری پبلک میں رائج ہیں یہاں بھی نافذ کیے جائیں۔

۲۔ سوراج سے پہلے بھی کسانوں اور مزدوروں کی آزادی اور خوش حالی کے لیے کام کرنا۔

۳۔ اُن سب پارٹیوں سے تعاون کرنا جو ہمارے بیان کردہ اغراض ومقاصد میں ہماری مدد کریں۔

۴۔ کمیونزم کے اصولوں کے حق میں رائے عامہ پیدا کرنا تاکہ سوراج ملتے ہی ان پر عمل درآمد کیا جاسکے۔

ہماری تنظیم خالصتاً ہندوستانی ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ہماری پارٹی کا دائرہ کار ہندوستان ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہمارے تعلقات عمومی طور پر ملک سے باہر دوسری ہم مسلک پارٹیوں بالخصوص 'تیسری انٹرنیشنل' کے ساتھ محض ہمدردی اور نظریاتی ہم آہنگی تک محدود ہوں گے۔ اس راہ پر ہم ان کے ہم سفر ہیں اُن کے تابع نہیں۔ نہ ہم ان کی کوئی عملی امداد کرسکتے ہیں اور نہ وہ ہمیں کوئی مالی امداد پہنچاتے رہیں۔

بعض بدطینت افراد یہ الزام لگاتے ہیں کہ کیمونزم لازمی طور پر مذہب دشمن تحریک ہے۔ حالانکہ حقیقتِ امر یہ ہے کہ مذہب کے معاملے میں ہمارا رویہ حد درجہ رواداری اور فراخدلانہ ہے۔ ہر وہ شخص جو ہمارے اصولوں کو تسلیم کرتا ہے ہماری پارٹی میں شریک ہوسکتا ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو، عیسائی ہو یا بدھ، ناستک ہو یا آستک۔ دوسرے لفظوں میں ہم تمام مذاہب کو تسلیم کرتے ہیں اور لامذہبیت کو بھی مذہب ہی سمجھتے ہیں۔

ہمارے بعض مسلمان رہنما بے جا طور پر کیمونزم کو اسلام کا مخالف بنا کر پیش کرتے ہیں جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مثلاً اسلام میں سرمایہ داری کی مخالفت تو کیمونسٹ تصورات سے بھی زیادہ شدت سے کی گئی ہے۔[1]

مولانا حسرت موہانی کا قول تھا کہ میں پہلے نیشنلسٹ تھا۔ ۱۹۲۵ء میں، میں نے یہ خیال ترک کر دیا اور کیمونزم کے اصولوں کو اپنایا۔ اب میں کیمونسٹ ہوں۔[2]

مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلی بابت ۱۹۳۸ء میں کئی مضامین سوشلزم کی حمایت میں لکھے۔ مثلاً 'سوشلزم کیا چاہتا ہے'، 'روس کی نئی پود کی ترقی'، 'پنڈت نہرو اور سوشلزم'، 'سوشلزم اور مولانا آزاد'، 'اسلام اور سوشلزم'۔

حوالہ جات

۱۔ انڈین سالانہ رجسٹر، جلد دوم، (انڈیا، ۱۹۲۵ء)، ص ص ۳۶۷۔۷۱

۲۔ عبدالشکور، حسرت موہانی، (آگرہ، ۱۹۴۴ء)، ص ۲۳

سوشلزم۔ کچھ خیالی، کچھ حقیقی۔ ۱

ہفت روزہ 'ایشیا' جماعت اسلامی کا سرکاری ترجمان ہے۔ اس کی اشاعت مورخہ یکم مارچ ۱۹۷۰ء میں مفتی محمد یوسف صاحب کا ایک مضمون چھپا ہے جس میں سوشلزم کی تاریخ بیان کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سوشلزم کی ابتدا مزدک نے کی اور پھر' کارل مارکس یہودی اور لینن اور انجلز نے جدید اشتراکیت کی صورت میں پیش کیا ہے۔' موصوف نے کسی عرب مصنف کی کتاب کے حوالے سے مزدکیت کی تاریخ بھی بیان کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوشلزم کے بارے میں مفتی صاحب کی معلومات فقط اس ایک کتاب 'اشتراکیہم واسلامنا' تک محدود ہیں ___ کیونکہ کارل مارکس، لینن اور اسٹالین کے مفروضہ حوالے بھی موصوف نے اسی کتاب سے دیئے ہیں۔ یہ نہیں بتایا کہ سوشلزم کے ان مفکرین نے اپنی کس تصنیف میں اور کس صفحے پر یہ مفروضہ باتیں لکھی ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم مزدک اور سوشلزم کے بارے میں مفتی صاحب کے ارشادات یا یوں کہیے کہ محمد بشیر العوف مصنف 'اشتراکیہم واسلامنا' کے اعتراضات کا جائزہ لیں، مفتی صاحب کی اطلاع کے لیے یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ علمائے سائنس اور عمرانیات کی تحقیق کے مطابق انسان کو انسان بنے تقریباً پانچ لاکھ برس کا عرصہ گزرا ہے۔ اس میں سے چار لاکھ ۹۵ ہزار برس ایسے گزرے ہیں جن کو تمام علما اور مؤرخ 'ابتدائی کمیونزم' (Primitive Communism) کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں۔ اسی ابتدائی کمیونزم کے دور میں زبانیں ایجاد ہوئیں جو انسانی

ہفت روزہ 'لیل و نہار' کراچی، ۲۹ مارچ ۱۹۷۰ء

معاشرے کی اشتراکی کوششوں کا سب سے نمایاں اور پائیدار مظہر ہیں۔ چنانچہ زبان خواہ وہ اُردو ہو یا عربی، پنجابی ہو یا انگریزی آج بھی پورے معاشرے کی اشتراکی ملکیت ہے نہ کہ ذاتی ملکیت۔ مفتی صاحب اگر اس مسئلے پر کبھی سنجیدگی سے غور کریں گے تو انہیں اپنے آپ سے نفرت ہونے لگے گی کہ میں صبح سے شام تک بولتے وقت ایک اشتراکی تخلیق سے اپنے زبان ولب کو گندا کرتا رہتا ہوں۔

ابتدائی کمیونزم

دنیا کا ہر معاشرہ خواہ وہ عربی ہو یا عجمی ابتدائی کمیونزم کے دور سے گزرا ہے۔ اس دور کا انسان چھوٹے چھوٹے قبیلوں اور گروہوں میں بٹا ہوتا تھا۔ یہ قبیلے جنگلوں، صحراؤں، یا پہاڑ کے غاروں میں رہتے تھے۔ (شہر اور بستیاں اس وقت تک وجود میں نہیں آئی تھیں۔) وہ جنگلی جانوروں کا شکار کر کے یا پھل پھلاری کھا کر اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ تیر کمان، نیزہ، تبر ان کے اوزار تھے جن میں پتھر یا ہڈی کے نوکیلے ٹکڑے لگے ہوتے تھے۔ ان کو معاشی اصطلاح میں آلاتِ پیداوار کہتے ہیں۔ یہی آلاتِ پیداوار جب بدل جاتے ہیں تو معاشرے کا پورا ڈھانچہ بدل جاتا ہے۔ یہ آلاتِ پیداوار بھی پورے قبیلے کی مشترکہ ملکیت ہوتے تھے اور جو شکار وہ مارتے تھے وہ بھی پورے قبیلے کی مشترکہ ملکیت ہوتا تھا۔ چنانچہ شکار کو آپس میں برابر برابر بانٹ لیا جاتا تھا اور شکاری کو بھی اتنا ہی ملتا تھا جتنا دوسروں کو۔ علمائے عمرانیات اس دور کو پتھر کا زمانہ کہتے ہیں۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اشرکیت مزدک کی ایجاد ہے سرتا سر غلط ہے۔ اشتراکیت کسی فرد کی ایجاد نہیں ہے بلکہ زندگی کے تقاضوں کی ایجاد ہے اور یہ تقاضے انسانی زندگی کے ساتھ ہی وجود میں آئے۔ اب سے لاکھوں برس پہلے جب مزدک کیا اس کے آباؤاجداد بھی پیدا نہ ہوئے تھے انسان اپنی بقا کے لیے آپس میں مل جل کر رہنے پر مجبور تھا۔ شیر، بھالو، چیتے، بھیڑیے اور دوسرے درندوں میں گھرا ہوا انسان ایسا نہ کرتا تو آج مفتی صاحب انفرادی ملکیت کے تقدس کا پرچار کرنے کے لیے موجود نہ ہوتے۔

افلاطون کی سوشلزم

یہ تو تھی اشتراکیت کی ابتدا معاشرتی اعتبار سے لیکن قدیم اشتراکیت کی فکری اساس کا موجد بھی

مزدک نہیں ہے بلکہ افلاطون ہے جو مزدک سے تقریباً نو سو برس پہلے یونان میں پیدا ہوا تھا۔ (۴۲۸۔۳۴۷ق۔م) اشتراکیت کے بارے میں سب سے قدیم تحریریں اسی کی ہیں اور اس کا قوی امکان ہے کہ مزدک اپنے عقائد میں افلاطون کی تعلیمات سے متاثر ہوا تھا۔ افلاطون کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ ایک 'ری پبلک' یعنی جمہوریت اور دوسری 'لاز' یعنی قوانین۔ ان کتابوں میں افلاطون نے ایک مثالی جمہوریت کا نقشہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ اس مثالی جمہوریت کے منتظمین کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ:

> 'اب ذرا غور کیجیے کہ اگر یہ لوگ ہمارے خیال کے مطابق عمل کریں تو ان کا طریقۂ زندگی کیا ہوگا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اُن کی قطعاً کوئی ذاتی ملکیت نہیں ہوگی سوائے اُن چیزوں کے جو بالکل ہی ضروری ہیں۔ اُن کا نہ تو اپنا کوئی ذاتی مکان یا گودام ہوگا جو ہر شخص کے لیے کھلا نہ ہو۔ ان کی خوراک وہی ہوگی جو تربیت یافتہ سپاہیوں کو ملتی ہے اور وہ لنگر خانے میں چھاؤنی کے سپاہیوں کی مانند کھانا کھائیں گے۔'

(باب سوئم ۴۱۶)

افلاطون اپنی دوسری کتاب 'لاز' میں جو بعد کی تصنیف ہے لکھتا ہے:

> 'ریاست اور حکومت اور قانون کی پہلی اور اعلیٰ ترین شکل وہ ہے جس میں یہ پرانی کہاوت رائج ہو کہ دوستوں میں سب چیزیں مشترک ہیں۔ عام اس سے کہ دنیا میں اس وقت کسی مقام پر بھی عورتوں، بچوں اور املاک کا اشتراک...... ممکن ہے یا نہیں میں کہتا ہوں کہ کوئی شخص اس سے زیادہ سچی، بہتر اور پاکیزہ ریاست نہیں قائم کر سکتا۔'

(لاز، ص ۷۳۹)

ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ جدید سوشلزم کا افلاطون کے ان خیالات سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

مزدک کون تھا؟

اب آیئے ذرا مزدک کے بارے میں مفتی صاحب کے فرمودات کا جائزہ لیں۔ مزدک کی تاریخ

ولادت اور ابتدائی زندگی پر گمنامی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ہم بس اتنا جانتے ہیں کہ وہ ساسانی فرمانروا قباد اور اس کے جانشیں خسرو انوشک رُدبان (نوشیرواں) کا ہم عصر تھا۔ وہ ایران کے صوبۂ فارس (جنوب مغرب) کے شہر فسا کا رہنے والا تھا اور نوشیرواں کی سازش سے ۵۲۸ء میں قتل ہوا تھا۔

اُس زمانے میں ساسانی سلطنت کی عظیم الشان عمارت فقط دو ستونوں پر کھڑی تھی۔ ایک اُمرائے سلطنت اور دوسرے زرتشتی کلیسا۔ ایرانی سلطنت کی ساری زمین انہیں دونوں کی ملکیت تھی۔ زرتشتی کلیسا بہت طاقتور تھا یہاں تک کہ شہنشاہ بھی اس کی مرضی سے انحراف کی جرأت نہیں کرسکتا تھا اگر کبھی کوئی مصلح یا صاحبِ دل ایرانی معاشرے میں اصلاح کی تلقین کرتا تو اسے 'زندیق' اور بے دین کہہ کر قتل کردیا جاتا تھا۔ چنانچہ بابل کے مشہور مفکر اور فن کار مانی (۲۱۵ء۔ ۲۷۳ء) کو اسی بنا پر نہایت بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ زرتشتی کلیسا نے رسوم، اوہام پرستی اور تہواروں کا ایک جال بچھا رکھا تھا اور لوگوں کے ذہن مفلوج کردیئے تھے۔ کوئی شخص ظلم و مصائب کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔

مگر نئے خیالات کے رو کلیسا کی آہنی دیواروں سے بھی نہ رک سکی۔ یہ خیالات عیسائی مبلغین اور افلاطونی فلسفیوں کے ذریعے ایران میں داخل ہوئے۔ دینِ مسیحی کے اولین مبلغ بہت معمولی لوگ تھے۔ ان میں کوئی دستکار تھا کوئی مچھیرا تھا اور کوئی ملاح۔ وہ عیسائیت کو غریبوں کے دکھ درد کا مداوا سمجھتے تھے اور ان سب کا رجحان اشتراکیت کی جانب تھا۔ (انہی مبلغین کی تعلیمات سے متاثر ہوکر یورپ میں ۱۹ویں صدی میں کرسچین سوشلزم کی تحریک چلی تھی۔) ان لوگوں نے بازنطینی سلطنت کے مظالم سے تنگ آکر ایران میں پناہ لی تھی۔

یہ ہے وہ پس منظر جس میں مزدک اور اس کی تعلیمات کا جائزہ لینا چاہیے مگر مزدک کی بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ قلم درکفِ دشمن است یعنی اس کے راوی وہی زرتشتی دستاتیر ہیں جنہوں نے اسے اور اُس کے ساتھیوں کو قتل کیا تھا اور یہی روایات عرب مؤرخین کا بھی ماخذ ہیں۔ چنانچہ ۱۹ویں صدی سے بیشتر کی تصنیفات میں مزدک کے بارے میں وہی باتیں ملتی ہیں جو زرتشتی کلیسا نے اس سے منسوب کی تھیں البتہ ۱۹ویں صدی میں مغربی مستشرقین بالخصوص جرمن پروفیسر نولدیکے نے بڑی تلاش و تحقیق سے مزدک کے کچھ حالات یکجا کیے۔ نولدیکے کی خدمات کو سراہتے ہوئے

پروفیسر براؤن اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'تاریخِ ادبیات ایران' میں لکھتا ہے:

'ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مزدک کے حالات اُن لوگوں کے بیانات پر منحصر ہیں جو اُس کی تعلیمات کے جانی دشمن تھے۔ پارسی اور عیسائی اور اگر اُس کی صفائی میں شہادتیں موجود ہوتیں تو شاید اس کی تعلیمات کے بعض خوشگوار پہلو بھی سامنے آجاتے۔'

(جلد اول، ص ۱۷۰-۱۶۹)

مزدک کی تعلیمات کیا تھیں؟ مزدک کہتا تھا کہ 'تمام برائیوں کی جڑ حسد، غصہ اور لالچ ہے جس نے انسانی مساوات کو جس کا حکم یزداں نے دیا ہے، برباد کردیا ہے اسی مساوات کی تجدید اُس کا مقصد تھا' (ص ۱۷۰) مانی کی مانند مزدک بھی درویشی کا قائل تھا اور خون بہانے اور گوشت کھانے کو منع کرتا تھا۔ وہ زمین کی مساوی تقسیم کی تعلیم دیتا تھا۔

ایرانی رعایا نے قدرتی طور پر مزدک کی تعلیمات کا خیر مقدم کیا چنانچہ اُس کے پیروؤں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ تب اُمراء دربار اور پیران کلیسا کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ اگر اس تحریک کا جلد انسداد نہ کیا گیا تو اُن کے املاک و جائداد کی خیر نہیں مگر کہتے ہیں کہ قباد خود مزدک کا ہم خیال تھا کیونکہ وہ اُمراء سلطنت اور زرتشتی کلیسا کی گرفت سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ ان لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ بادشاہ کا رجحان بھی مزدک کی جانب ہے تو انہوں نے قباد کے خلاف سازش کی اور اُسے تخت سے اتار کر اُس کے بھائی جاماسپ کو ساسانی تخت پر بٹھادیا۔

کچھ عرصے کے بعد قباد نے اپنے مخالفین سے سمجھوتہ کرلیا اور دوبارہ بادشاہ بن گیا۔ تب اُس کے بیٹے خسرو نوشیرواں نے ایک دن مزدک اور اس کے بہت سے ساتھیوں کو دعوت کے بہانے محل میں بلایا اور بیدردی سے قتل کردیا۔ نوشیرواں 'عادل' نے مزدک کے باب میں عدل کی وہ رسمیات بھی پوری نہ کیں جو یونانیوں نے سقراط کو زہر کا پیالا پلانے سے پہلے روا رکھی تھیں۔

خیالی سوشلزم

اب ذرا سوشلزم کا کچھ بیان ہوجائے۔ مؤرخین سوشلزم کی دو قسمیں کرتے ہیں۔ ایک خیالی

سوشلزم اور دوسری سائنسی یا مارکسی سوشلزم۔ افلاطون اور مزدک وغیرہ کا شمار خیالی سوشلسٹوں میں ہوتا ہے۔ یوں تو قرونِ وسطیٰ میں بھی ایسے متعدد اہلِ درد مفکر اور مصلح قوم پیدا ہوئے جو دولت مندوں کی عیش پسندی اور مفلسوں کے آلام پر کڑھتے تھے (حضرت ابوذر غفاریؓ اور صوفیائے کرام) لیکن یورپ میں سرمایہ داری نظام کے فروغ کے ساتھ ایسے دانشور بھی پیدا ہونے لگے جو ایک ایسے معاشرے کی خیالی تصویر پیش کرتے تھے جس میں افلاس، بے روزگاری، احتیاج، جہالت اور بیماری کا نام ونشان نہ ہوگا۔ کوئی کسی کا دست نگر اور محکوم نہ ہوگا اور سب لوگ سکھ چین کی زندگی بسر کریں گے۔ اسی خیال کو مولانا روم نے یوں پیش کیا ہے۔

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد
کسے را بہ کسے کارے نہ باشد

لیکن خیالی سوشلسٹ اپنے خلوصِ نیت کے باوجود یہ بتانے سے معذور تھے کہ ایسا مثالی معاشرہ کون قائم کرے گا اور کیسے کرے گا۔

سر تھامس مور کی یوٹوپیا

ان خیالی سوشلسٹوں میں سب سے مشہور سر تھامس مور ہے جو برطانیہ کے بادشاہ ہنری ہشتم کا وزیراعظم تھا اور بعد میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی تصنیف 'یوٹوپیا' (۱۵۱۵ء) آج بھی دنیا کی عظیم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ تھامس مور نے یوٹوپیا میں سولہویں صدی کے برطانوی معاشرے کا مقابلہ ایک خیالی جزیرے کے معاشرے سے کیا ہے۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے دولت کی مشترکہ ملکیت کا ایک منظم تصور پیش کیا۔ اس کی خیالی ریاست میں دولت پیدا کرنے کے تمام ذرائع ــــ زمین، معدنی کانیں، کارخانے وغیرہ ــــ قوم کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ ملک کا نظم ونسق جمہوری ہے۔ سب کو محنت کا مساوی پھل ملتا ہے۔ لوگ فقط چھ گھنٹے کام کرتے ہیں اور بقیہ وقت سائنس اور آرٹ کی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔ تعلیم عام ہے لیکن طلبا کو جسمانی محنت بھی کرنی پڑتی ہے۔ شہر اور دیہات میں کوئی تصادم نہیں اور نہ جسمانی اور ذہنی کام کرنے والوں میں کوئی فرق کیا جاتا ہے۔

اسی سے ملتے جلتے عقائد اطالوی پادری کمپانیلا (۱۵۶۸ء تا ۱۶۳۹ء) کے بھی تھے۔ وہ بڑا روشن

خیال اور صوفی منش انسان تھا۔ چنانچہ کلیسا نے اُس پر کفر اور بدعت کا فتویٰ لگایا اور جسمانی ایذائیں پہنچائیں بالآخر اسے قید کر دیا گیا۔ وہ ۲۷ برس قید رہا۔ اسی دوران میں اُس نے ایک کتاب 'روشنی کا شہر' لکھی جس میں ایک مثالی ریاست کا نقشہ پیش کیا گیا تھا۔ کمپانیلا کی کمیونسٹ سوسائٹی ایک دینی ریاست تھی جس کے حاکم دانشمند پادری تھے۔ یہ لوگ عقل اور قوانینِ قدرت کے مطابق حکومت کرتے تھے۔ بچے ریاست کی ملکیت تھے اور ان کی تعلیم و تربیت ریاست کے ذمّے تھی۔ اپنے عہد کی سوسائٹی کا مذاق اڑاتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ 'یہ لوگ عجیب ہیں کہ اپنے گھوڑوں اور کتوں کی نگہداشت اور افزائشِ نسل کا تو بے حد خیال رکھتے ہیں لیکن آدمی کے بچے پر کوئی توجہ نہیں دیتے'۔ مور کی 'یوٹوپیا' میں محنت کے اوقات چھ گھنٹے تھے۔ کمپانیلا نے گھٹا کر چار کر دیئے۔

اٹھارویں صدی میں خیالی سوشلسٹوں کی تعداد میں اور اضافہ ہوا۔ یہ انقلابِ فرانس کا عہد تھا اور عقل و انصاف کی حکمرانی، مساوات اور خوشحالی کا چرچا بہت عام تھا۔ ان میں روسو، موریلی، میبلی اور بالوف کے نام زیادہ معروف ہیں۔ یہ لوگ عہدِ قدیم کی سادہ زندگی کو سراہتے تھے اور ایک ایسی اشتراکی سوسائٹی کی تلقین کرتے تھے جس میں طبقاتی امتیاز کا کوئی وجود نہ ہو۔

> 'موجودہ سوسائٹی کا بانی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے ایک قطعہ زمین کو گھیر کر کہا کہ ''یہ میری ملکیت ہے'' اور سادہ لوحوں نے اس کی بات مان لی۔ اگر کسی شخص نے اس آدمی کی حد بندیوں کو توڑ پھینکا ہوتا اور آواز لگائی ہوتی کہ اس بہروپیے سے ہوشیار۔ زمین کا پھل تم سب کی ملکیت ہے اور زمین کسی ایک آدمی کی ملکیت نہیں تو دنیا کتنے جرائم سے، کتنی جنگوں سے، کتنی مصیبتوں اور کتنی تکلیفوں سے بچ جاتی'۔
>
> (روسو عدم مساوات کی ابتدا)

انیسویں صدی کے خیالی سوشلسٹوں کی تعلیمات اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ جدید سوشلزم کے بانیوں کارل مارکس اور اینگلز نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان میں سینٹ سائمن، چارلس فوریئر اور رابرٹ اووین سرِ فہرست ہیں۔

ان مفکرین کا خیال تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے عقل اور

انصاف کے اُصولوں پر عمل نہیں کیا ہے لہٰذا ضرورت فقط یہ ہے کہ سماج کا ایک ایسا مکمل منصوبہ تیار کیا جائے جو عقل وانصاف پر مبنی ہو۔ پھر اس منصوبے کو پروپیگنڈے کے ذریعے لوگوں میں مقبول بنایا جائے اور جہاں کہیں ممکن ہو اس منصوبے کے مطابق تجربے کیے جائیں تاکہ لوگ ان نمونوں کو دیکھنے کے بعد اس نئے نظام کی خوبیوں کے قائل ہو جائیں۔ چنانچہ سینٹ سائمن نے ۱۸۰۲ء میں اپنے مشہور 'جینوا کے خطوط' شائع کیے۔ ۱۸۰۸ء میں فوریئر کی پہلی کتاب چھپی اور ۱۸۰۰ء میں اووین نے نیویارک کے مقام پر اپنی مثالی کالونی قائم کی۔

فرانس کے خیالی سوشلسٹ

سینٹ سائمن فرانس کے ایک نواب کا بیٹا تھا۔ حُریت پسندی کے جوش میں وہ امریکہ کی جنگِ آزادی میں شامل ہو کر لڑ بھی چکا تھا اور جب فرانس میں انقلاب آیا تو اُس نے نوابی کا خطاب واپس کر دیا اور انقلابیوں میں شریک ہو گیا۔

سینٹ سائمن سوسائٹی میں فقط دو طبقے ہیں۔ ایک 'کام کرنے والوں' کا طبقہ اور دوسرا 'کاہلوں کا طبقہ'۔ وہ سب لوگ جو پیداوار یا تقسیم پیداوار میں حصہ لیے بغیر اپنی بے کمائی آمدنی پر جیتے ہیں کاہل ہیں اور مزدور، کاشت کار حتیٰ کہ سوداگر، کارخانے دار اور بینکر سب کام کرنے والے ہیں۔ کاہل طبقے میں معاشرے کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت اب باقی نہیں ہے مگر مشکل یہ تھی کہ وہ بے ملکیت والے طبقوں کو بھی حکومت کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ ایسی حالت میں سالارِ کارواں کون بنے؟

سینٹ سائمن کی رائے تھی کہ سائنس اور صنعت کو یکجا کر دیا جائے تاکہ خیالات کا وہ اتحاد دوبارہ قائم ہو جائے جو ناپید ہو گیا تھا لیکن سائنس اُس وقت عبارت تھی 'پڑھے لکھے طبقوں' سے اور صنعت عبارت تھی 'کام کرنے والے' سرمایہ داروں، تاجروں، بینکروں اور کارخانہ داروں سے۔ سینٹ سائمن کی خواہش تھی کہ سرمایہ دار اپنے آپ کو پبلک کا خادم اور معاشرے کی دولت کا امین ومحافظ تصور کریں۔ البتہ انہیں اس بات کی اجازت تھی کہ مزدوروں کے مقابلے میں حاکمانہ حیثیت رکھیں اور معاشی اعتبار سے انہیں زیادہ رعایتیں حاصل ہوں لیکن سینٹ سائمن اس بات پر بہت زور دیتا تھا کہ اصل مقصد اُن کی فلاح و بہبود ہے جو تعداد میں سب سے زیادہ ہیں اور سب سے زیادہ کام کرتے ہیں۔

فوریئر کا تعلق فرانس کے درمیانے طبقے سے تھا۔ اس کا باپ تاجر تھا اور وہ خود بھی عرصے تک کلرک رہ چکا تھا۔ وہ ایک ایسی سماج کی تخلیق کا قائل تھا جس میں انسان کے جذبات کی تسکین اور فروغ کا پورا بندوبست ہو۔ اس کے لیے اُس نے اپنے 'فلانگ' کا منصوبہ بنایا جس میں ہر شخص کے لیے کام کی ضمانت تھی۔ ہر آدمی دن میں ایک قسم کا کام ڈیڑھ دو گھنٹے کرے، اور پھر کسی دوسرے کام پر لگ جائے تاکہ کام کی یکسانیت سے اس کی طبیعت اُکتا نے نہ پائے۔ فلانگ میں دولت کی تقسیم کا پیمانہ محنت اور لیاقت تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ سرمایہ داروں کو بحث وتمحیص سے 'فلانگ' کا مؤید بنایا جاسکتا ہے۔

فوریئر کا شمار فرانس کے چوٹی کے طنز نگاروں میں ہوتا ہے۔ انقلابِ فرانس کے زوال پر سٹہ بازی اور دغابازی کا جو بازار گرم ہوا اور تاجرانہ ذہنیت نے فروغ پایا فوریئر نے اُس کی بڑی سچی تصویر کھینچی ہے۔ سرمایہ داروں کے جنسی تعلقات اور سرمایہ داری سماج میں عورت کی حیثیت کا نقشہ کھینچنے میں تو اس نے کمال کر دیا ہے۔ فوریئر ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے کہا تھا کہ عورت کی آزادی سماجی آزادی کی کسوٹی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام پر کڑی تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ :

> 'اس مہذب دور نے ہر اُس برائی کو جو بربریّت کے دور میں سادہ شکل میں رائج تھی پیچیدہ، مبہم اور منافقانہ رنگ میں رنگ دیا۔ سرمایہ دارانہ تہذیب اب ایک بھنور میں گھر گئی ہے۔ وہ اپنے تضاد کو بلا ان کا حل پیش کیے ہوئے، نئے سرے سے زندہ کرتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی منزلِ مقصود پر یعنی اُس منزل پر پہنچنے کے بجائے جس کا وہ جھوٹا وعدہ کرتی ہے اُس مقام پر پہنچتی ہے جو منزلِ مقصود کی ضد ہے۔ چنانچہ اس تہذیب کے دور میں افراط کے پیٹ سے افلاس پیدا ہوتا ہے۔'

برطانیہ میں خیالی سوشلزم

رابرٹ اووین (۱۷۷۱ء تا ۱۸۵۸ء) عالم باعمل تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ انسان کا کردار اُس کے ماحول سے بنتا ہے۔ اگر ماحول اچھا ہو تو بُرے سے بُرا آدمی بھی سدھر جاتا ہے۔ وہ کارخانے دار تھا لہٰذا سرمایہ داری کی برائیوں سے بھی ذاتی طور پر بخوبی واقف تھا۔ اس نے ایک ایسے بے طبقاتی

معاشرے کا منصوبہ بنایا جس کی ہر ایک وحدت تین سو سے دو ہزار آدمیوں تک محدود ہو۔ چنانچہ اُس نے سکاٹ لینڈ میں نیولنارک کے مقام پر سوتی کپڑے کا ایک کارخانہ خریدا اور اپنے نظریات کو پانچ سو مزدوروں کی جماعت پر آزمانا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ اُس کی کالونی کی آبادی ڈھائی ہزار تک پہنچ گئی۔ ابتدا میں جب ان لوگوں نے کارخانے میں کام کرنا اور کالونی میں رہنا شروع کیا تو اُن کی اخلاقی حالت بہت گری ہوئی تھی۔ اووین نے اس نوآبادی کو مستقبل کی سماجی زندگی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ بنا دیا۔ اس نوآبادی میں نہ شراب نوشی تھی، نہ لڑائی جھگڑے، نہ پولیس، نہ عدالت، نہ مقدمہ، نہ گداگری اور نہ خیرات کیونکہ لوگوں کے کام کرنے کے حالات بہت اچھے تھے اور رہن سہن کا ماحول نہایت خوشگوار تھا۔ اووین نے نئی نسل کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ دی چنانچہ بچوں کے سب سے پہلے مدرسے کا بانی رابرٹ اووین ہی ہے۔ جدید قسم کے یہ مدرسے سب سے پہلے نیولنارک ہی میں قائم ہوئے۔ بچوں کو دو سال کی عمر میں مدرسے بھیج دیا جاتا۔ وہاں اُن کی دلچسپی کی اتنی چیزیں فراہم کی جاتیں اور اُنہیں اتنا لطف آتا کہ وہ گھر جانے کا نام بھی نہ لیتے تھے۔

اُس وقت سرمایہ داروں کے کارخانوں میں مزدوروں کو تیرہ چودہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا لیکن نیولنارک میں محنت کے اوقات فقط ساڑھے دس گھنٹے تھے۔ ایک بار کپاس کی منڈی میں گڑبڑ مچی نیولنارک کا کارخانہ چار مہینے تک بند رہا۔ اس کے باوجود مزدوروں کو برابر اُجرت ملتی رہی اور کاروبار بھی دُگنا بڑھ گیا۔

مگر اووین مطمئن نہ تھا۔ اُس نے سوچا کہ ڈھائی ہزار کی یہ بستی کاج کے لیے روزانہ اتنی ہی دولت پیدا کرتی ہے جتنی آج سے پچاس سال پہلے چھ لاکھ آدمیوں کی بستی پیدا کرتی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ ڈھائی ہزار اور چھ لاکھ آدمیوں کے استعمال میں آنے والی دولت کا فرق کیا ہوگا۔ جواب صاف تھا اسی فرق میں سے کارخانے میں روپیہ لگانے والے سرمایہ داروں کو پانچ فی صدی کے حساب سے سود ادا کیا گیا۔ تین لاکھ پونڈ منافع اس پر مستزاد تھا پھر جب نیولنارک کا یہ حال تھا تو انگلستان کے دوسرے صنعتی کارخانوں کا کیا پوچھنا۔ یہ نئی دولت اور قوت مزدوروں کے سوا کس کی پیدا کی ہوئی تھی۔ لہٰذا اس قوت کا پھل بھی ان ہی کو ملنا چاہیے۔ رابرٹ اووین کو ایک نئے سماجی نظام کا راز ہاتھ آیا۔ ایسا نظام جس میں پیداواری قوتیں سماج کی پنچایتی ملکیت ہوں

تاکہ سب کو فائدہ پہنچے۔

جب تک اووین فلاحی کام کرتا رہا اس کی تعریفیں ہوتی رہیں لیکن جونہی اس نے عملی سوشلزم کا نعرہ لگایا سرکاری حلقے، اخبار، سیاسی لیڈر سب اس کے خلاف ہو گئے یہاں تک کہ اس کا نیا تجربہ بھی ناکام بنا دیا گیا۔

سوشلزم۔ کچھ خیالی، کچھ حقیقی۔۲

۲۹ مارچ کی اشاعت میں ہم نے افلاطون سے رابرٹ اووین تک کے خیالی سوشلزم کا جائزہ لیا تھا۔ یہ مفکرین اپنے زمانے کے معاشرتی حالات بدلنے کے آرزومند تھے تاکہ عام لوگ سُکھ چین سے زندگی بسر کرسکیں۔ کوئی کسی کا محتاج نہ ہو اور نہ کوئی کسی دوسرے کی محنت کا پھل کھائے۔ اُن کو یقین تھا کہ معاشرے کی اصلاح کا اگر کوئی معقول اور منصفانہ منصوبہ تیار کرلیا جائے تو اسے قبول کرنے پر کسی کو اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن تقدیریں، خواہشوں سے نہیں بدلا کرتیں۔ اُن کو معلوم نہ تھا کہ معاشرے کی حرکت اور تبدیلی کے چند قانون اور چند شرطیں ہیں جو افراد کی خواہشوں اور آرزؤں سے بالاتر ہیں۔ وہ پوری بنی نوع انسان کی نجات کے خواہاں تھے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ اب تک سماج میں جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ معاشرے کے سب سے انقلابی طبقوں کی بدولت آئی ہیں۔ ان مفکرین کو اپنے عہد کے انقلابی طبقوں کا اور اُن کے تاریخی منصب کا شعور نہ تھا اور نہ وہ یہ بتا سکتے تھے کہ یہ تبدیلیاں کون لائے گا اور کیسے لائے گا۔

مارکس پہلا انقلابی

کارل مارکس وہ پہلا انقلابی مفکر ہے جس نے سوشلزم کو نئے اُصولوں پر مرتب کیا۔ کارل مارکس کا زمانہ (۱۸۱۸ء تا ۱۸۸۳ء) یورپ میں بڑی بڑی سائنسی ایجادات اور انکشافات کا زمانہ تھا جن کی وجہ سے مغربی معاشرے میں عظیم مادّی اور فکری انقلابات پیدا ہورہے تھے۔ بھاپ کے انجن اور

ہفت روزہ لیل و نہار، کراچی، ۵ را پریل ۱۹۷۰ء

بھاری مشینوں اور کلوں کی ایجاد سے پیداوار کئی سو گنا بڑھ گئی تھی۔ کیمیا، طبیعات، ارضیات، فلکیات اور حیوانات کے علم کی بدولت انسان کائنات اور موجودات کی حقیقت سے آگاہ ہوتا جا رہا تھا۔ اُس نے مادّے کے چھوٹے سے چھوٹے ذرّے کی حرکت اور تغیر کے قوانین بھی دریافت کر لیے تھے۔ اسی طرح آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی تھی کہ سرمایہ داری یا جاگیرداری نظام دنیا میں ہمیشہ سے قائم نہیں ہیں بلکہ معاشرہ اس سے قبل کئی اور ادوار سے گزر چکا ہے لہٰذا ان ادوار کی مانند سرمایہ داری نظام کا خاتمہ بھی ایک نہ ایک دن لازمی ہے اور پھر ڈارون کے اس نظریہ ارتقا نے تو دنیا کو حیران و ششدر کر دیا تھا کہ انسان کا تعلق بندروں کی نسل سے ہے جو لاکھوں برس کے ارتقائی عمل کے بعد انسان بنی ہے۔

کارل مارکس نے بون (مغربی جرمنی کا موجودہ دارالحکومت) یونیورسٹی سے فلسفے میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اپنی صحافتی اور سیاسی زندگی کے دوران میں اُس نے معاشیات تاریخ اور سیاسیات کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اُس کی تصنیفات میں 'کیمونسٹ مینی فیسٹو'، 'اُجرتی مزدور اور سرمایہ'، 'فلسفے کا افلاس'، 'مقدس خاندان' اور 'سرمایہ' سب سے مشہور ہیں۔ لیکن اُس کا شاہکار 'سرمایہ' ہے جس میں اُس نے سرمایہ داری نظام کی تشریح اور تنقید کی ہے۔ اس کی تعلیمات کا نچوڑ یہ ہے کہ:۔

۱۔ ہر انسانی معاشرے کی بنیاد اُس کی اقتصادیات یا معاشیات پر ہوتی ہے یعنی اس بات پر کہ سماج اپنی دولت (خوراک، پوشاک، برتن باسن، سواری اور ضرورت کی دوسری چیزیں) کس طرح پیدا کرتا ہے۔ کس طرح ان کو آپس میں بانٹتا ہے اور کس طرح اُن کا تبادلہ کرتا ہے۔ نظم و نسق کے طریقے، قانون، رسم و رواج، اخلاق، افکار و عقائد اور ادب و فنون کی پوری عمارت اقتصادیات ہی کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔ جب اقتصادی بنیادیں بدل جاتی ہیں تو جلد یا بدیر عمارت کا بالائی ڈھانچہ بھی بدل جاتا ہے۔ 'وجود شعور کو متعین کرتا ہے۔ شعور وجود کو متعین نہیں کرتا'

۲۔ دولت کی پیداوار کے سلسلے میں انسان ابتدا ہی سے تقسیم کار کے اُصول پر کاربند رہا ہے۔ شروع شروع میں یہ تقسیم کار عورتوں اور مردوں کے درمیان تھی۔ مرد جنگلی جانوروں کا شکار کرتے تھے۔ عورتیں بچوں کی دیکھ بھال کرتیں، کھانا پکاتیں اور کھالوں سے پوشاک تیار کرتی

تھیں لیکن جب ذاتی ملکیت کا رواج ہوا تو تقسیم کار کی نوعیت بدل گئی۔ اب پیداوار کے سلسلے میں انسان انسان کے درمیان طبقاتی رشتے قائم ہو گئے۔ آقا اور غلام کا رشتہ زمیندار اور کاشتکار کا رشتہ، سرمایہ دار اور مزدور کا رشتہ۔ مارکس انہیں پیداواری رشتے کہتا ہے۔ اس رشتے میں ایک طبقہ دولت پیدا کرتا ہے۔ دوسرا طبقہ اس دولت کا مالک ہوتا ہے۔

۳۔ ان میں سے ہر پیداواری رشتہ ایک مخصوص سماجی نظام کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسانی سماج برابر ترقی پذیر ہے یعنی اُس میں وقتاً فوقتاً بنیادی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں کسی ایک شخص، بادشاہ، جنرل، فلسفی یا لیڈر کے حکم سے نہیں ہوتیں اور نہ حادثے کے طور پر نمودار ہوتی ہیں بلکہ ان کے کچھ قانون اور قاعدے ہیں۔ مثلاً جب پیداواری رشتے پیداوار کی نئی قوتوں (نئے آلات اور اوزار پیداوار، محنت کے نئے ہنر اور طریقے وغیرہ) کا ساتھ نہیں دے سکتے یا اُن قوتوں کی ترقی روکنے لگتے ہیں تو سوسائٹی پیداوار کے پرانے رشتوں کو توڑنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ رشتے آپ ہی آپ نہیں ٹوٹ جاتے ہیں بلکہ یہ تاریخی فریضہ وہ طبقے سرانجام دیتے ہیں جو پیداوار کی نئی قوتوں سے وابستہ ہوتے ہیں تب نئی پیداواری قوتیں ترقی کرنے لگتی ہیں اور پیداوار بڑھنے لگتی ہے اور معاشرے میں سماجی انقلاب رونما ہوتا ہے۔

انقلاب کے محرکات

۱۔ برطانیہ میں سترھویں صدی میں اور فرانس میں اٹھارویں صدی میں جو سماجی انقلاب آیا اور صدیوں کے فرسودہ جاگیری نظام کی جگہ سرمایہ داری نظام قائم ہوا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہاں کے بادشاہ اور روٴسا دوسرے ملکوں کے بادشاہوں اور رئیسوں سے زیادہ ظالم یا عیش پسند تھے بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ وہاں صنعتی ایجادوں اور بیرونی تجارت کی وجہ سے جو پیداواری قوتیں اُبھری تھیں جاگیری نظام اُن کی راہ میں حائل تھا۔

۲۔ خود پاکستان میں ہمارے آپ کے دیکھتے دیکھتے جو سماجی تبدیلیاں آئی ہیں وہ بھی اسی نوعیت کی ہیں۔ صنعتی کارخانوں، فیکٹریوں اور بینکوں کی بدولت پرانے رشتے ٹوٹ رہے ہیں اور اب ملک کی معاشی قسمت کا فیصلہ نواب اور جاگیردار نہیں کرتے بلکہ سرمایہ دار کرتے ہیں۔ یہ

دوسری بات ہے کہ ہمارے نواب اور جاگیردار اب خود سرمایہ دار بننے کی کوشش کررہے ہیں۔ گندم ہو یا کپاس، پٹ سن ہو یا چائے، خام مال ہو یا مصنوعات سب چیزیں اب سرمایہ داروں کی مرضی سے بیچی اور خریدی جاتی ہیں۔

۳۔ جب سے ذاتی ملکیت (زمین، کارخانے، آلات پیداوار وغیرہ) کا رواج ہوا ہے، سوسائٹی دو طبقوں میں بٹ گئی ہے ایک طبقہ دولت پیدا کرنے والوں کا ہے اور دوسرا اس دولت سے فائدہ اٹھانے والوں کا ان میں برابر ٹکر رہتی ہے۔ یہ طبقاتی کشمکش سرمایہ داری نظام کی خصوصیت بھی ہے لیکن سرمایہ داری نظام میں ایک تضاد ایسا ہے جو پچھلی سوسائٹیوں میں نہ تھا۔ سرمایہ داری نظام میں پیداوار کا طریقہ تو اشتراکی ہے لیکن پیداوار کی ملکیت انفرادی ہے یعنی فیکٹریوں اور کارخانوں میں جو مال پیدا ہوتا ہے اُسے سب مزدور مل کر پیدا کرتے ہیں اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اسے اکیلے تیار کیا ہے حالانکہ جاگیری نظام کا دست کار یا ہنر مند یا کاشت کار جو کچھ پیدا کرتا ہے خود اکیلے پیدا کرتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کی تمام خرابیوں کی جڑ یہی ہے کہ پیداوار تو مشترکہ ہوتی ہے لیکن اس کی ملکیت اور تقسیم مشترکہ نہیں ہوتی اسی وجہ سے معاشرے میں بحران آتا ہے۔ کبھی زائد پیداوار یعنی افراط کی وجہ سے اور آلو اور گندم جیسی ضروری چیزیں جلا دی جاتی ہیں اور کبھی پیداوار کی کمی اور بے روزگاری کی وجہ سے۔

۴۔ سب لوگوں کے لیے سُکھ چین کی جس زندگی کا خواب خیالی سوشلسٹوں نے دیکھا تھا اُس کا امکان اب پیدا ہوا ہے کیونکہ سائنس کی نت نئی ایجادوں اور صنعتی ترقیوں کی وجہ سے اب پیداوار اتنی بڑھ گئی ہے کہ دنیا کے سب باشندوں کی زندگی کی ضروریات آسانی سے پوری کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ پیداوار کی ملکیت بھی پیداوار کے طریقوں کی مانند مشترکہ ہو جائے۔ مگر یہ تاریخی فریضہ کون پورا کرے گا۔

۵۔ یہ تاریخی فریضہ مزدور طبقہ اور اُس کا حلیف دہقان طبقہ سرانجام دے گا کیونکہ سرمایہ داری نظام کا سب سے انقلابی طبقہ مزدوروں کا ہے۔ اُن کی تخلیقی زندگی یوں بھی اشتراکی ہے۔ اب تک جن طبقوں نے سماجی انقلاب کا تاریخی رول ادا کیا، انقلاب کے بعد وہی برسرِ اقتدار آئے اور انہوں نے دوسرے طبقوں کو اپنا محکوم بنالیا لیکن تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوگا کہ مزدور طبقہ نہ صرف اپنے کو حکمراں طبقے کی غلامی سے آزاد کرے گا بلکہ پورے معاشرے کو سرمایہ داری کی

لعنتوں سے نجات دلائے گا۔

کارل مارکس سرمایہ داری نظام کی جگہ اشتراکی نظام کے قیام کو اٹل اور لازمی قرار دیتا ہے۔ لیکن سوشلزم کی ساری بحث میں وہ نہ عدل وانصاف کی دہائی دیتا ہے اور نہ اخلاق و مذہب کی۔ وہ تو خالص منطقی دلائل اور تاریخی شہادتوں سے یہ ثابت کرتا ہے کہ معاشرے کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ داری نظام کو ختم کر دیا جائے کیونکہ یہ نظام جو ذاتی نفع کی بنیاد پر قائم ہے معاشرے کی پیداواری قوتوں اور تخلیقی صلاحیتوں کو آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔

مارکسزم محنت کشوں کا___ تمام دنیا کے محنت کشوں کا خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی، ہندو ہوں یا پارسی___ انقلابی فلسفہ ہے۔ کارل مارکس، اینگلز اور لینن تمام عمر سرمایہ داری نظام کے خلاف لڑتے اور لکھتے رہے۔ وہ کلیسا کے پادری نہ تھے اور نہ کسی مذہبی فرقے کی اصلاح کرنے اٹھے تھے۔ وہ تو سرمایہ داری نظام کے نقاد تھے اور سوشلزم کے مبلغ۔ وہ جانتے تھے کہ آلات پیداوار اور پیداواری رشتوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ سرمایہ دار ہندو بھی ہوسکتا ہے، مسلمان بھی، عیسائی بھی اور یہودی بھی اسی طرح مزدور یا کاشت کار بھی، ہندو یا مسلمان ہوسکتا ہے۔ سرمایہ دار جو برتاؤ اپنے ہم مذہب مزدوروں سے کرتا ہے وہی دوسرے سے بھی لہٰذا اُن کے فکر و عمل کا دائرہ رنگ و نسل اور مذہب کی قید سے آزاد تھا۔ وہ انسانوں کی مادّی، اخلاقی اور ذہنی زندگی سنوارنے کے لیے جدوجہد کرتے تھے۔ لوگاں کی عاقبت سنوارنے کا دعویٰ اُنہوں نے کبھی نہیں کیا۔

مذہب کا حربہ

کارل مارکس، اینگلز اور لینن اگر لوگوں کے مذہبی عقیدوں سے سروکار نہ رکھتے تھے تو اس کی ایک وجہ اور بھی تھی وہ یہ کہ قرونِ وسطیٰ کا زمانہ مدت گزری ختم ہو چکا تھا اور اب کلیسا کی مجال نہ تھی کہ سیاست میں دخل دے سکے اب تو مذہب ہر شخص کا ذاتی فعل ہو گیا تھا جس کا جی چاہے اس پر عمل کرے جس کا جی چاہے عمل نہ کرے۔ لہٰذا کارل مارکس اور اُس کے ساتھیوں کو اپنی انقلابی سرگرمیوں کے دوران میں مذہبی مسائل میں الجھنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

قصہ یہ ہے کہ سوشلزم کے دشمن کُھل کر یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ سرمایہ داری نظام یا جاگیرداری نظام بہت اچھا ہے لہٰذا وہ اپنی مدافعت کے لیے مذہب کا حربہ استعمال کرتے ہیں تاکہ عام لوگ

سوشلزم سے بدظن ہو جائیں حالانکہ سوشلزم سرمایہ داری نظام کا حریف ہے نہ کہ مذہب کا۔ ہم سرمایہ داری کے حامیوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم میں اخلاقی جرأت ہے تو تم علانیہ کہتے کیوں نہیں کہ سرمایہ داری نظام سوشلزم سے بہتر ہے۔ شب خون کیوں مارنا چاہتے ہو۔ سوشلزم سرمایہ داری نظام پر جو اعتراض کرتا ہے تم اپنی دلیلوں سے اُنہیں رد کیوں نہیں کرتے۔ تم لوگوں کو بتاؤ کہ قدر فاضل کا نظریہ غلط ہے (ہم نے اس مضمون میں قدر فاضل سے بحث نہیں کی ہے مگر آئندہ کسی موقعے پر بتائیں گے کہ کس طرح سرمایہ دار اپنے ہر مزدور سے دس گھنٹے کام لیتا ہے مگر اُجرت اُس کو فقط پانچ گھنٹے کی دیتا ہے۔ اس طرح اگر اُس کے کارخانے میں ایک ہزار آدمی کام کرتے ہیں تو وہ روزانہ پانچ ہزار گھنٹے کی پیداوار بلا اُجرت دیئے حاصل کر لیتا ہے اور یہی اُس کی دولت کا راز ہے)۔ طبقاتی جدوجہد فرضی بات ہے اور سرمایہ دار کسی کا حق نہیں مارتا بلکہ اپنی گاڑھی کمائی کا پھل کھاتا ہے۔ تم سوشلزم اور سرمایہ داری کی جنگ میں مذہب کی اڑنگ اگر لگاتے ہو تو یہ وہی بات ہوئی کہ کوئی شخص جمہوریت کی خوبیاں اور آمریت کی برائیاں گنوائے اور تم اُس سے پوچھو کہ بتایئے آپ جنت اور دوزخ میں ایمان رکھتے ہیں یا نہیں؟ آپ روح اور فرشتے کے قائل ہیں یا نہیں؟

تمام 'ازموں' کے خلاف

مفتیانِ پاکستان نے اب ایک اور نعرہ شروع کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تمام 'ازمیات' کے خلاف ہیں خواہ وہ امپیریلزم ہو کیپٹل ازم ہو، فیوڈل ازم ہو یا سوشلزم ہو۔ ہم ان حضرات کی بات مان لیتے ہیں مگر اس سوال کا جواب چاہتے ہیں کہ اس برصغیر میں ڈیڑھ سو سال تک امپیریلزم کا تسلط رہا اور فیوڈلزم اور کیپٹل ازم بھی عام مسلمانوں کو لوٹتے رہے لیکن آپ نے کبھی ان 'ازموں' کے خلاف نعرۂ حق کیوں بلند نہیں کیا۔ البتہ جب ملک میں سوشلزم کا چرچا عام ہونے لگا تو آپ کو تمام 'ازمیات' کی برائیاں کیوں یاد آنے لگیں۔ اگر واقعی اس سے پہلے 'ازمیات' کی آواز آپ کے کانوں میں نہیں پڑی تھی تو مناسب یہی ہے کہ پہلے فیوڈلزم اور کیپٹل ازم کے 'ازمی' طلسم کو توڑ دیجیے جس نے قوم کو مدت سے اپنے جال میں پھنسا رکھا ہے پھر عمر وفا کرے تو دوسرے 'ازموں' سے بھی نبرد آزمائی کر لیجیے گا۔

کیا سوشلزم بیرونی نظریہ ہے؟

ان دنوں 'بیرونی نظریہ' کی اصطلاح بہت عام ہے۔ مسلم لیگ، جماعت اسلامی، پی۔ڈی۔ پی غرضیکہ دائیں بازو کی تمام جماعتیں پاکستان کے بارہ کروڑ باشندوں کو 'بیرونی نظریات' سے بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں۔ قیوم خاں، نواب زادہ نصر اللہ خاں، مولوی مودودی، ایوب کھوڑو، شوکت حیات خاں، مولوی احتشام الحق تھانوی اور اُن کے رفقاء ابنائے وطن کو بیرونی نظریوں کے خطرے سے مسلسل آگاہ کر رہے ہیں اور اب تو یہ حضرات برملا کہتے ہیں کہ اگر بیرونی نظریات کا جلد قلع قمع نہ کیا گیا تو پاکستان کا وجود ہی باقی نہ رہے گا۔ ان بزرگوں کے نزدیک سب سے مہلک بیرونی نظریہ سوشلزم کا ہے۔

بیرونی نظریے سے ان لوگوں کی مُراد غالباً وہ افکار ہیں جو برِصغیر پاک و ہند کی سرحدوں سے باہر وضع ہوئے اور اب بیرونی مال کے طور پر ہمارے ملک میں درآمد ہو رہے ہیں۔ یہ تصفیہ کرنے سے پہلے کہ آیا سوشلزم بیرونی نظریہ ہے یا نہیں آیئے ذرا دیکھیں کہ گذشتہ ہزار سال میں اس خطۂ ارض کے باشندوں نے کن کن 'بیرونی' نظریوں کو قبول کیا ہے۔

اسلام کا نظریہ

۱۔ سب سے پہلا 'بیرونی' نظریہ جس کو برِصغیر پاک و ہند کے باشندوں نے اب سے ہزار بارہ سو برس پہلے قبول کیا اسلام تھا۔ یہ نظریۂ حیات جناب رسالت مابؐ کی وساطت سے مکہ اور مدینہ

ہفت روزہ 'لیل و نہار'، کراچی، ۲۴ اگست ۱۹۷۰ء

کی سرزمین پر ظہور پذیر ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ نہ آنحضرتؐ اس برِصغیر کے باشندے تھے اور نہ مکہ اور مدینہ کبھی ہمارے حدود میں شامل تھے۔

۲۔ اسلام ایرانیوں، ترکوں، مصریوں، چینیوں، افغانوں اور ہندوستانیوں غرضیکہ حجاز سے باہر کی تمام آبادی کے لیے ایک بیرونی نظریہ تھا لیکن ظہورِ اسلام کو ابھی دو تین صدیاں بھی نہ گزری تھیں کہ یہ انڈونیشیا سے مراکش تک تمام ایشیا اور افریقہ میں پھیل گیا۔ جن لوگوں نے اسلام کے محاسن کو سمجھا انہوں نے اُسے ہنسی خوشی قبول کرلیا اور یہ نہیں کہا کہ اسلام تو ایک بیرونی نظریہ ہے، ہم اس کو کیوں اپنائیں۔

۳۔ اسلام آیا تو برِصغیر میں عربی رسم الخط بھی رائج ہوا حالانکہ یہ رسم الخط بھی خالص بیرونی تھا۔ اس رسم الخط کا اثر یہاں تک بڑھا کہ سندھی، پشتو اور اُردو بولنے والوں نے تھوڑی ترمیم اور اضافے سے عربی حروف ہجا کو اپنے حروف ہجا کے طور پر قبول کرلیا اور عربی رسم الخط کو بھی اپنالیا۔

۴۔ ابتداء میں یہاں جو بادشاہتیں قائم ہوئیں اُن سب کے فرمانروا بیرونی تھے۔ کوئی افغانستان سے آیا تھا، کوئی ایران سے اور کوئی تُرکستان سے۔ ان کے دورِ حکومت میں برِصغیر کی سرکاری زبان فارسی ہوگئی جو بیرونی زبان تھی اس زبان کے رواج کے ساتھ ہمارے ملک میں ایرانی تہذیب اور ایرانی علم و ادب کو بہت فروغ ہوا یہاں تک کہ ہم نے اس بیرونی زبان کے ایک بیرونی شاعر مولانا روم کی مثنوی کو 'ہست قرآں در زبانِ پہلوی' کا لقب دیا اور آنکھوں سے لگایا۔ اُس وقت کسی سیاست داں یا عالمِ دین نے ان 'بیرونی' اثرات پر کُفر کا فتویٰ نہ لگایا۔

۵۔ مسلمانوں ہی کے دور میں یہاں یونانی طب کی طرح پڑی۔ یہ 'بیرونی' حکمت اتنی مقبول ہوئی کہ آریوویدک طب جو یہاں صدیوں سے رائج تھی ماند پڑ گئی اور یونانی طب ہماری تہذیب کا اس طرح جُزو بن گئی کہ عوام اسے اسلامی طب سمجھنے لگے۔

۶۔ ہم نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ خالص اسلامی درس گاہوں میں بھی یونانی فلسفہ، یونانی منطق اور یونانی سائنس (ہیئت اور نجوم وغیرہ) کو نصاب میں شامل کرلیا۔ اسلامی دارالعلوم میں یہ یونانی علوم آج تک پڑھائے جاتے ہیں اور علماء کرام کو خبر ہی نہیں کہ یہ علوم غیر اسلامی ہیں۔ ہم نے ارسطو کو معلّم اوّل کا خطاب دیا اور افلاطونی اور نو افلاطونی افکار سے اپنے ذہنوں کے

اُفق روشن کیے۔

۷۔ امام ابوحنیفہؒ سے امام غزالیؒ تک فقہا، علما اور مفسرین کا ایک طویل سلسلہ موجود ہے۔ ہم نے ان بزرگوں کے افکار سے استفادہ کیا اور کبھی نہ سوچا کہ وہ عربی یا عجمی یعنی غیر ملکی ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں نے قرآنی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے علم و حکمت کی نعمتیں جس سمت اور جس ملک سے آئیں قبول کیں اور یہ دلیل کبھی نہیں دی کہ چونکہ یہ علم یونان یا توران سے آیا ہے لہٰذا ہم اس کو رد کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے عروج کا بڑا سبب یہی تھا کہ اُنہوں نے اپنے ذہن کی کھڑکیاں ہمیشہ کھلی رکھیں اور نئے علوم و فنون کو سیکھنے سے کبھی گریز نہ کیا، عباسیوں، فاطمیوں، عثمانیوں، صفویوں، پٹھانوں اور مغلوں کا دورِ عروج دراصل وہی تھا جس میں 'بیرونی' افکار و نظریات کا خیر مقدم کیا گیا اور جب مسلمانوں نے اپنے ذہن کی کھڑکیاں بند کر لیں اور تازہ ہوا کے جھونکوں سے پرہیز کرنے لگے تو ان کا عروج زوال میں بدل گیا۔

یہاں تک ذکر تھا اسلام کے 'بیرونی' نظریات کے ردّ و قبول کا۔ اب ذرا مغربی نظریات کی طرف آیئے۔ برِصغیر کے باشندے مغربی علوم و فنون سے اُنیسویں صدی میں روشناس ہوئے۔ انگریزوں نے چھاپے خانے قائم کیے اور اخبار نکالے اور نئے نئے قوانین و ضوابط وضع کیے۔ درس گاہوں میں مغربی علوم پڑھائے جانے لگے اور ایک بار پھر 'بیرونی' نظریوں نے رواج پایا۔ ان بیرونی نظریوں نے ہماری سوچ کا انداز ہی بدل دیا۔ اور ہماری روایتی فکروں اور تہذیبی قدروں میں انقلاب آ گیا۔

سائنسی علوم میں گلیلیو، کوپرنیکس، فیراڈے، لواشیئے، پیسچر، نیوٹن، ڈالٹن اور ڈارون کے 'بیرونی' نظریے عام ہوئے۔ گردشِ زمین کا نظریہ جو روایتی نظریہ (گردشِ آفتاب) کی عین ضد تھا۔ کششِ ثقل کا نظریہ خلیوں (Cell) کا نظریہ، جراثیم کا نظریہ، ارتقائے حیات کا نظریہ (جو تخلیقِ کائنات کے عقیدے کی نفی کرتا ہے) غرض کہ درجنوں سائنسی نظریات جو بیرونی تھے ہمارے نصاب میں داخل ہو گئے۔

سب بیرونی نظریے

سیاسیات میں ہمیں افلاطون، ارسطو، روسو، ہابس، لاک اور جان اسٹوارٹ مل وغیرہ کے نظریے

بڑھائے گئے۔ انہی بیرونی نظریوں کی بدولت ہمارے مصلحین اور سیاست دانوں میں قومیت اور وطنیت کا نیا شعور پیدا ہوا اور وہ ہندوستان کے حقوق کی باتیں کرنے لگے۔ انہی بیرونی نظریوں کے طفیل ہماری زبان میں درجنوں نئی اصطلاحیں بھی رائج ہوئیں۔ آئین، ری پبلک، جمہوریت، پارلیمنٹ، نمائندہ حکومت، اقتدارِ اعلیٰ، ووٹ، بالغ رائے دہی، بیلٹ بکس، ریفرنڈم، شہری آزادی اور شہریت وغیرہ ایسے تصورات ہیں جن سے ہم لوگ انگریزوں سے پہلے بالکل ناآشنا تھے۔ ان تصورات کو سب سے پہلے سرسید احمد خان، مولانا حالی، مولانا شبلی اور اُن کے ہم خیال مصلحین نے اپنایا اور ان کی تبلیغ کی۔ پھر رفتہ رفتہ یہ بیرونی نظریات ہماری سماجی فکر کا جُز بن گئے اور آج کسی کو یہ خیال نہیں آتا کہ یہ سات سمندر پار سے آئے ہیں، اس سرزمین کی پیداوار نہیں ہیں۔ آپ پاکستان کی کسی یونیورسٹی کا نصابِ تعلیم اُٹھا کر دیکھیے آپ کو نوے فی صدی علوم وفنون مغرب سے درآمد کیے ہوئے ملیں گے۔ معاشیات، عددیات، عمرانیات، ارضیات، نباتات، علم الابدان، حیوانیات، طبعیات، کیمسٹری، بایوکیمسٹری، میڈیسن، صحافت، یہ تمام وہ علوم ہیں جن میں بیرونی نظریات غالب ہیں۔ ان نظریات کی تعلیم ہمارے لیے بے حد مفید ہے اور ان سے پاکستان کو کوئی خطرہ نہیں البتہ ہم ان نظریات وعلوم کی تعلیم اگر ترک کر دیں تو پھر پاکستان یقیناً خطرے میں پڑ جائے گا کیونکہ ہماری ترقی رُک جائے گی اور ہم قرونِ وسطیٰ کی تاریکیوں میں واپس چلے جائیں گے۔

پاکستان کی ترقی اور پاکستانی باشندوں کی فلاح و بہبود کے لیے جتنے مفید اور ضروری یہ علوم وفنون ہیں اتنی ہی مفید اور ضروری وہ جدید صنعتیں ہیں جو یہاں قائم ہیں یا قائم ہو رہی ہیں۔ ریل گاڑی، موٹر سائیکل، کپڑا سینے کی مشین، ہوائی جہاز، بجلی اور بجلی کے بلب، گھڑیاں، لالٹین غرضیکہ روزمرّہ استعمال کی درجنوں چیزیں ہیں جو بیرونی ملک سے یہاں آئیں اور ہم نے ان کو پسند کیا کیونکہ وہ مفید تھیں۔ پھر ہم نے بھاری مشینیں درآمد کیں اور کپڑے، جوٹ، سیمنٹ، پلاسٹک، المونیم اور دوسری چیزوں کے کارخانے اور فیکٹریاں لگائیں جن کی وجہ سے لاکھوں پاکستانیوں کو روزگار ملا اور لوگوں کا معیارِ زندگی بہتر ہوا۔ اس طرح پاکستان قرونِ وسطیٰ کے جاگیری دور سے نکل کر صنعتی دور میں داخل ہو گیا۔

اب قصہ یہ ہے کہ بھاری مشینوں کا صنعتی نظام فقط دو ہی اُصولوں پر چل سکتا ہے۔ سرمایہ داری اُصولوں پر یا اشتراکی اُصولوں پر۔ کارخانے، فیکٹریاں اور ملیں کسی تیسرے طریقے سے چلائی نہیں

جاسکتیں یہ صنعت گاہیں یا تو افراد کی ذاتی ملکیت کے طور پر چل سکتی ہیں یا پوری قوم کی مشترکہ ملکیت کے طور پر۔ تیسرا کوئی طریقہ نہ اب تک ایجاد ہوا ہے نہ ہوسکتا ہے۔ دائیں بازو کے وہ لیڈر جو کہتے ہیں کہ تمام 'ازمیات' لعنت ہیں یعنی کیپٹل ازم (سرمایہ داری) اور سوشلزم دونوں قابلِ گردن زدنی ہیں، دراصل لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں، اور در پردہ سرمایہ داری کی حمایت کرتے ہیں۔

'ازمیات' سے آسان نجات

ممکن ہے کوئی صاحب یہ کہیں کہ انہیں 'ازمیات' سے نجات پانے کے لیے تو ہم اسلامی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اچھا صاحب ہم نے تھوڑی دیر کے لیے مان لیا کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہوگیا ہے۔ اب آپ بتایئے کہ آدم جی، باوانی، ولیکا، سہگل اور دوسرے سرمایہ داروں کے کارخانوں اور فیکٹریوں کو آپ کن اُصولوں پر چلائیں گے۔ مثال کے طور پر سعودی عرب کو لیجیے۔ وہاں اسلامی شریعت پر بڑی سختی سے عمل ہوتا ہے۔ چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔ شراب پینا اور بیچنا بڑا بھاری جُرم ہے۔ نماز اور روزے کی پابندی لازمی ہے۔ ان تمام شرعی احکام کے باوجود وہاں تیل کے کارخانے اور دوسری چھوٹی موٹی صنعتیں سرمایہ داری کے اُصول ہی پر چلتی ہیں یعنی وہ افراد کی ذاتی ملکیت ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اسلامی نظام میں مزدوروں کی اُجرت بہت بڑھ جائے گی اور اُن کو تعلیم، دوا، علاج اور رہائش وغیرہ کی مناسب سہولتیں حاصل ہوں گی مگر یہ سہولتیں تو سرمایہ داری نظام میں بھی ملتی ہیں مثلاً امریکہ کے مزدوروں کی اُجرت پاکستانی مزدوروں سے دس گنا زیادہ ہے۔ اُن کا معیارِ زندگی بھی بہت اونچا ہے تو کیا وہاں سرمایہ داری نظام ختم ہوگیا۔

جو لوگ 'ازمیات' سے بیزار ہیں اُن کے لیے دراصل ایک ہی راستہ ہے۔ وہ ریل گاڑی کی پٹریاں اُکھاڑ ڈالیں۔ بجلی پیدا کرنے والے پاور ہاؤس میں آگ لگادیں۔ تمام فیکٹریوں، ملوں اور کارخانوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں۔ بینکوں میں قفل لگادیں اور پھر اُسی 'سنہری' زندگی میں واپس چلے جائیں جو سو ڈیڑھ سو سال بیشتر یہاں برتی جاتی تھی۔ اس زندگی کا نمونہ دیکھنا ہو تو سندھ، بلوچستان یا سرحد کے کسی دور افتادہ گاؤں کے مزارع یا ہاری کی جھونپڑی کی سیر کیجیے۔ آپ کو قرونِ وسطیٰ کی خوبیوں کا خود بخود اندازہ ہوجائے گا۔ اگر فیکٹریوں، ملوں اور کارخانوں کی

شکست وریخت مہمل اور محال ہے تو پھر ہمیں دونوں میں سے ایک اِزم کو قبول کرنا ہوگا۔ یہ دونوں اِزم بیرونی ہیں اور دونوں ہی دو متضاد بیرونی نظریات کی بنیاد پر چلتے ہیں لہٰذا دونوں میں سے ایک 'بیرونی' نظریہ کو قبول کیے بغیر چارہ نہیں۔ دائیں بازو کی جماعتوں نے سرمایہ داری کے 'بیرونی' نظریہ کو مدت ہوئی قبول کر لیا لیکن وہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے شرماتی ہیں۔ بائیں بازو کی جماعتیں سوشلزم کے 'بیرونی' نظریے کو اعلانیہ تسلیم کرتی ہیں کیونکہ اُن کو محنت کشوں کے اس انقلابی فلسفے کو اپنانے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی۔

نظریات کا کوئی وطن نہیں ہوتا

دراصل نظریات کا خواہ وہ سائنسی ہوں یا سماجی کوئی وطن نہیں ہوتا۔ وہ عالمی میراث ہوتے ہیں۔ وہ پوری انسانیت کی ملکیت ہوتے ہیں اور دنیا کے ہر ملک کے باشندوں کو اس کا پورا پورا حق ہوتا ہے کہ انہیں قبول کریں یا رد کر دیں۔

نظریات زمان و مکان سے آزاد نہیں ہوتے بلکہ گردوپیش کے مادّی حالات و واقعات کے گہرے مطالعے کے بعد وضع کیے جاتے ہیں مثلاً سرمایہ داری نظام کا نظریہ (آزاد مسابقت اور نجی ملکیت وغیرہ) صنعتی انقلاب کے سماجی حالات و واقعات کی بنیاد پر وضع کیا گیا۔ اسی طرح سوشلزم کا نظریہ سرمایہ داری نظام سے پیدا ہونے والے حالات اور واقعات کی روشنی میں وضع ہوا۔ لہٰذا دنیا کے جس گوشے میں بھی جدید صنعت و حرفت کا غلبہ ہوگا وہاں سوشلزم لازمی طور پر مقبول ہوگا کیونکہ جدید صنعت و حرفت سے پیدا ہونے والے حالات کا تقاضا یہی ہے اور سماج کو اگر آگے بڑھنا ہے تو پھر ہمیں ان تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔

دراصل کسی نظریہ کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا انحصار اس پر نہیں ہوتا کہ وہ کہاں پیدا ہوا اور کس ملک یا قوم سے تعلق رکھتا ہے بلکہ اس پر ہوتا ہے کہ آیا وہ نظریہ ہمارے لیے مفید ہے یا نہیں، آیا وہ ذہنی، روحانی اور مادّی ترقی میں ہماری مدد کرتا ہے یا نہیں، آگے بڑھنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے یا نہیں۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو ہم اُسے قبول کر لیتے ہیں ورنہ رد کر دیتے ہیں۔ دنیا کی تمام قوموں کا مسلک یہی رہا ہے۔

سوشلزم ایسا ہی ایک نظریہ ہے جو انسانی تاریخ کے ارتقا اور سرمایہ داری نظام کے گہرے

مطالعے کے بعد وضع ہوا ہے۔ درحقیقت سوشلزم محنت کشوں کا (بالخصوص مزدوروں کا) انقلابی فلسفۂ حیات ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ سرمایہ داری نظام میں پیداوار کا طریقہ اشتراکی ہوتا ہے یعنی مزدور فیکٹریوں اور کارخانوں میں ایک ساتھ مل کر سامان پیدا کرتے ہیں لیکن ذرائع پیداوار ایک مخصوص طبقے کی ذاتی ملکیت ہوتے ہیں اور وہ ان کی پیداوار سے ذاتی نفع کماتا ہے۔ اس تضاد کی وجہ سے سماجی ترقی میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں اور محنت کشوں کو ان کی محنت کا پورا اجر نہیں ملتا لہٰذا سرمایہ داری نظام کی جگہ اشتراکی نظام کا قیام لازمی اور اٹل ہے۔

بیرونی نظریہ کی بے بنیاد منطق

سوشلزم کی تحریک یورپ اور امریکہ وغیرہ میں تقریباً سو سال سے رائج ہے۔ سوشلزم کے بانی کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز جرمنی کے باشندے تھے اُن کی تصنیفات کا دنیا کی سبھی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے لیکن فاشسٹ ملکوں (اسپین، جنوبی افریقہ) کے علاوہ ان کتابوں کا پڑھنا کہیں ممنوع نہیں ہے اور نہ کوئی یہ کہتا ہے کہ چونکہ اس نظریے کے بانی جرمن تھے لہٰذا ہم اُسے قبول نہیں کریں گے۔

اگر 'بیرونی' نظریے کی منطق درست ہوتی تو دنیا کی آدھی آبادی نے اُسے ہرگز قبول نہ کیا ہوتا اور نہ آج روس، چین، کیوبا، ویت نام، ہنگری، پولینڈ اور دوسرے ملکوں میں سوشلسٹ نظام رائج ہوتا۔

اگر تحقیق کی جائے تو پتہ چلے گا کہ 'بیرونی نظریے' کا تصور بھی یاروں نے امریکہ سے درآمد کیا ہے۔ وہاں پر سینیٹ کی ایک 'اَن امریکن' کمیٹی ہوتی ہے۔ یہ کمیٹی اُن سرگرمیوں کی جانچ پڑتال کرتی ہے جن پر امریکی آئین کی خفیہ خلاف ورزی کا شبہ ہوتا ہے۔ ٹرومین اور آئزن ہاور کے زمانے میں اس کمیٹی کے بعض ارکان (میکارتھی) نے بڑا اُدھم مچایا تھا۔ وہ ہر اُس شخص کو امریکہ کا دشمن کہہ کر تنگ کرتے تھے جو امریکی سامراج کی جنگ باز پالیسی کا مخالف ہوتا تھا لیکن اس کمیٹی کی ملک میں شدت سے مخالفت ہوئی اور کمیٹی کا بازار سرد ہو گیا۔

پاکستان کے رجعت پرست عناصر بھی اسی رسوائے زمانہ امریکی کمیٹی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ اُن کے پاس طاقت نہیں لہٰذا وہ سوشلسٹوں پر کفر والحاد کے فتوے صادر کرتے ہیں اور سوشلزم کو غیر پاکستانی نظریہ کہہ کر بدنام کرنا چاہتے ہیں لیکن یہاں بھی ان کا وہی حشر ہوگا جو امریکہ میں میکارتھی وغیرہ کا ہوا۔

اسلامی ممالک کی آزادی اور سوویت روس

ہر ملک کی بیرونی پالیسی اس کی اندرونی پالیسی کا عکس ہوا کرتی ہے۔ فاشسٹ اور سامراجی پالیسی کا مقصد دوسری قوموں کو غلام بنانا ہے کیونکہ وہاں ان طبقوں کی حکومت ہے جو اوروں کی دولت سے نفع اٹھاتے ہیں۔ انقلاب سے پہلے روس کے حاکموں کی بھی یہی پالیسی تھی چنانچہ وہ اکثر ایران، افغانستان، ترکی اور دوسرے ہمسایہ ملکوں پر للچائی نظریں ڈالتے تھے اور ان ملکوں کا بٹوارہ کرنے کے لیے دوسری سامراجی طاقتوں سے ساز باز کرتے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں جب روس میں مزدوروں اور کسانوں کی پنچایتی حکومت قائم ہوئی تو اس نے اپنی اندرونی پالیسی کی بنیاد 'مزدوروں کو روٹی، کسانوں کو زمین، تمام قوموں کو حقِ خود اختیاری اور امن' پر رکھی۔ سوویت یونین کی بیرونی پالیسی اسی ترقی پسند اندرونی پالیسی کا عکس ہے۔ پچھلے پچیس سال میں سوویت یونین نے ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ دنیا کی دوسری قومیں بھی آزادی اور خود اختیاری کے اس حق سے محروم نہ رہنے پائیں۔ چنانچہ اس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ خود دوسرے ملکوں کی آزادی اور حقِ خود اختیاری کا احترام کرتا ہے اور حتی الامکان اس کی حفاظت کے لیے ان قوموں کی مدد کرنے کو بھی ہر دم تیار ہے۔

سوویت یونین کی اس بیرونی پالیسی کی آزمائش کہ ہر قوم کو آزادی اور خودمختاری کا پورا پورا حق حاصل ہے جلد ہوگئی۔ زارِ روس نے دورانِ جنگ میں ایران اور ترکی کے بٹوارے کے لیے برطانیہ اور فرانس کی سامراجی حکومتوں سے خفیہ معاہدے کیے تھے۔ سوویت یونین نے نہ صرف ان

'قومی جنگ'، بمبئی، ۱۸راپریل ۱۹۴۳ء

معاہدوں سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کیا بلکہ یہ خفیہ معاہدے چھاپ بھی دیئے جس سے سامراجی طاقتوں کی پول کھل گئی۔ اس نے ان حقوق اور مراعات سے بھی دست کشی کرلی جو زارشاہی نے ایران، ترکی اور افغانستان میں زبردستی حاصل کیے تھے اور پھر ان ملکوں کی مکمل آزادی تسلیم کرلی۔

ترکی کی آزادی

لیکن سامراجی طاقتیں ترکی، ایران اور افغانستان کے اس حق کو ماننے کے لیے تیار نہ تھیں، ترکی نے لڑائی میں جرمنی کا ساتھ دیا تھا یہ بہانہ ترکی کا بٹوارہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ لائیڈ جارج کی حکومت نے ترکی کے عرب علاقوں پر قبضہ کرنے پر اکتفا نہ کی بلکہ ترکی کے ساحلی صوبوں کو یونانی حکومت کے سپرد کردیا اور برطانوی فوجیں قسطنطنیہ پر قابض ہوگئیں۔ آبنائے باسفورس پر قبضہ کرنے کی پرانی آرزو آج پوری ہورہی تھی اور ترکی اپنی تاریخ کے سب سے تاریک دور سے گزر رہا تھا۔ یہی حال ایران اور افغانستان کا بھی تھا۔ سارے ایران پر برطانوی فوجوں کا تسلط تھا اور سلطانِ ترکی کی طرح شاہ قاچار بھی برطانوی شہنشاہیت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ کابل میں امیرِ افغانستان کی حیثیت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ لیکن وطنی آزادی کا جوش کہیں فوجوں کے روکے رُکا ہے۔ ترکی، ایران اور افغانستان تینوں اسلامی ملکوں میں آزادی کی تحریک تقریباً ایک ہی وقت ابھری اور ایک ہی وقت پروان چڑھی۔ نوجوان ترکوں نے کمال اتاترک کی رہبری میں اپنے ملک کی آزادی اور سالمیت کا اعلان کیا اور اپنے ملک کو یونانی فوجوں سے خالی کرانے کے لیے حملہ شروع کردیا۔ تمام سامراجی طاقتوں نے انہیں باغی کے لقب سے یاد کیا۔ لیکن انقرہ کی اس نوزائیدہ حکومت کو سب سے پہلے سوویت روس نے تسلیم کیا۔ (اپریل ۲۰ء) اور مارچ ۱۹۲۱ء میں سوویت اور ترکوں میں پہلا معاہدہ ہوا جس کی رو سے دو روسی ضلعے کارس اور ارزگان جہاں اکثریت ترکوں کی تھی لیکن جسے روسی سامراج نے ترکوں سے لے لیا تھا) ترکی کو واپس مل گئے۔ اب سوویت روس نے جنگی سامان، روپیہ، جنگی ماہرین اور سیاسی مشیر ترکی بھیجنے شروع کیے اور سوویت اور ترکی کے تعلقات اتنے بڑھے کہ کمال کی ہر فوجی جیت پر بالشویک لیڈر انہیں مبارک باد کے تار بھیجتے۔ آخر یونانی فوجیں ترکی سے بھگا دی گئیں۔ لیکن ترکی کی آزادی کی راہ میں ابھی کئی اور رکاوٹیں تھیں۔ قسطنطنیہ پر انگریزی قبضہ تھا اور سامراجی طاقتیں چاہتی تھیں کہ درۂ دانیال اور

آبنائے باسفورس انہیں کے ماتحت رہے۔ ترکی اس کے لیے تیار نہ تھا اور لینن و اسٹالن نے تو ۷ دسمبر ۱۹۱۷ء کے اعلان میں کہا تھا کہ 'قسطنطنیہ مسلمانوں کے قبضے میں رہنا چاہیے۔' چنانچہ لوزان کانفرنس میں جب یہ سوال اٹھا تو سوویت نے ترکی کی تائید کی۔ ترکی کو قسطنطنیہ میں تھوڑی فوج رکھنے کی اجازت ملی۔ لیکن درۂ دانیال کی مورچہ بندی کا حق نہ ملا۔ بارہ برس کے بعد جب ترکی نے مانترو کانفرنس میں درۂ دانیال کی مورچہ بندی کا سوال دوبارہ اٹھایا تو سوویت نے ترکی کا ساتھ دیا اور ترکی کو اس کا حق مل گیا کہ وہ درۂ دانیال کو مستحکم کرے اور صرف غیر جانبدار ملکوں کے جہازوں کو آبنائے باسفورس سے گزرنے دے۔

ایران اور افغانستان

ایران میں زارشاہی اور برطانوی سامراج کے پنجے زیادہ گہرے تھے۔ ایرانی حکومت برطانوی سامراج کو مختلف رعایتیں دینے پر بھی مجبور ہوئی تھی لیکن ۲۱ء میں سرخ فوج جیتنے لگی۔ اس فتح نے ایرانی محبانِ وطن کی ہمت بڑھائی اور برطانوی سامراج کے تسلط کو اتنا کمزور کردیا کہ فروری ۲۱ء میں ایرانیوں نے سامراج کی پٹھو کابینہ کو ہٹا دیا اور نئی کابینہ بنائی اور برطانوی تسلط سے چھٹکارا پایا۔ دوسرے ہی دن (۲۵ فروری ۲۱ء) ایرانی حکومت کے نمائندے نے ماسکو میں سوویت یونین اور ایران کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کی رو سے سوویت یونین ان تمام حقوق، مراعات، سرمائے اور مکانات وغیرہ سے دست بردار ہوگیا جو زارشاہی نے ایران میں حاصل کیے تھے۔

۱۹۱۹ء میں افغانستان کی حیثیت بھی برطانیہ کے نیم مقبوضہ علاقے سے زیادہ نہ تھی اور امان اللہ خان نے جب ہتھیار اٹھایا تو انہیں ہار ہوئی پھر بھی انگریزی حکومت کو افغانستان کی آزادی تسلیم کرنی پڑی کیونکہ افغان محبانِ وطن کی ہمسایہ بھی اب ایک ایسی انقلابی حکومت تھی جو ان کے آزادی کے حق کو مان کر ان کی پشت پناہی کے لیے تیار تھی۔

غیر جارحانہ معاہدے

۲۴ء سے سوویت کی بیرونی پالیسی کا نیا دور شروع ہوا۔ یہ معاشی تعمیر اور امن کا دور تھا۔ اس کے

لیے بیرونی امن اتنا ہی ضروری تھا جتنا اندرونی امن۔ لہٰذا سوویت یونین نے اپنے ہمسایہ ملکوں سے غیر جارحانہ معاہدے کیے تاکہ سوویت بے کھٹکے ہوکر اپنے ملک کی حالت سدھارے اور ہمسایہ ملکوں کو بھی کوئی خطرہ نہ رہے۔ پہلا غیر جارحانہ معاہدہ سوویت اور ترکی کے درمیان ۱۷ جنوری ۲۵ء کو ہوا جس میں طے پایا کہ اگر فریقین میں سے کسی ایک پر کوئی تیسری طاقت حملہ کرے تو فریقِ ثانی اس کا ساتھ دے گا۔ ۳۱ راگست ۲۶ء کو ایسا ہی ایک معاہدہ افغانستان کے ساتھ ہوا اور ۱۹۲۷ء میں ایران کے ساتھ۔ وہ ملک جو ہر لحہ زارشاہی کی زد میں رہتے تھے سوویت یونین کی طرف سے بالکل مطمئن ہو گئے اور اب کوئی ان کی آزادی چھیننے اور ان پر قبضہ کرنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔

اِدھر سوویت یونین دنیا میں امن قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا اُدھر یورپ میں فاشزم کا تاریک سایہ پھیل رہا تھا۔ ۳ جنوری ۳۳ء کو جرمنی میں نازیوں کا راج ہو گیا جو کھلے بندوں کہتے تھے کہ ہم ہر قوم کو جرمن قوم کا غلام بنا کر دم لیں گے۔ نازیوں کی اس پالیسی کے معنی آزاد قوموں کی غلامی اور عالمگیر جنگ کے تھے۔ سوویت یونین ان دونوں باتوں کے خلاف تھا چنانچہ اس نے تمام حکومتوں کو اس بڑھتے ہوئے خطرے سے متنبہ کیا اور اس کو روکنے کی متعدد تجویزیں بھی پیش کیں۔ لیکن برطانیہ اور فرانس کی حکومتیں ان دنوں ہٹلر کو خوش کرنے کی فکر میں تھیں اور چاہتی تھیں کہ ہٹلر مشرقی یورپ پر قبضہ کر کے سوویت پر حملہ کر دے۔ ایسی حالت میں وہ سوویت کی تجویزیں کیوں مانتیں۔ لیکن سوویت نے ہمت نہ ہاری اور ۳۳ء کی معاشی کانفرنس کے موقع پر اس نے ایران، افغانستان، ترکی، چیکوسلواکیہ اور کئی ملکوں کے ساتھ ایک میثاق پر دستخط کیے جس میں 'حملہ آور' کی تشریح کر کے یہ اعلان کیا گیا کہ یہ حکومتیں ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں گی اور نہ کسی دوسری حملہ آور طاقت کا ساتھ دیں گی۔

سوویت یونین کی کوشش تھی کہ دنیا کو جنگ اور فاشسٹوں سے بچایا جائے اور ہٹلر کے گرگے اس فکر میں تھے کہ ہر ملک میں اپنے گماشتوں کے ذریعے بغاوت کرائیں اور انتشار پیدا کریں۔ ایران اور ترکی پر ان کی خاص توجہ تھی۔ ترکی میں ہٹلر نے اپنے سفیر شاطر ڈپلومیٹ فان مہیاپن کو بھیجا اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نازی سفیر کو ترکی کے بعض اونچے طبقے کے لوگوں کو جو ترکی میں مزدوروں اور کسانوں کی بیداری سے گھبرا رہے تھے ہم خیال بنانے میں کسی حد تک کامیابی بھی

ہوئی۔ اس گروہ نے ترکی حکومت کی بیرونی پالیسی پر کچھ عرصے کے لیے بڑا اثر ڈالا اور اکتوبر ۴۱ء سوویت یونین اور ترکی میں باہمی فوجی امداد کی جو بات چیت ہو رہی تھی وہ ختم ہوگئی۔ ترکی کے سیاست داں حملے کے وقت سوویت کی مدد لینے کے لیے تیار تھے لیکن خود سوویت کی مدد کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ لیکن جب ہوا کا رخ بدلا اور سُرخ فوج کے جوابی حملے رنگ لانے لگے تو ترکی نے اپنے رویے میں تبدیلی کی اور سوویت اور ترکی کے تعلقات بہتر ہو گئے۔

ہٹلری سازش کا جال

ایران بھی نازیوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ نہ تھا وہاں فوجی حلقوں اور سرمایہ پرست طبقوں کے لیے فاشزم قدرتاً بہت مفید آلہ کار ثابت ہوا۔ چنانچہ درباری سرزمین پر فاشزم کا زہریلا پودا خوب پھولا پھلا۔ حکومت نے شہری آزادی پر پابندیاں لگا دیں۔ ایران کے جمہوری لیڈروں کو قید کر دیا اور نازی ایجنٹوں کی سازشوں کا جال سارے ایران میں پھیل گیا۔ نازیوں کی چال یہ تھی کہ ایران کو مرکز بنا کر سوویت یونین کے جنوبی علاقوں، جہاں مسلمانوں کی آزاد ریاستیں قائم ہیں اور ایران کے دوسرے ہمسایہ ملکوں اور ہندوستان پر حملہ کیا جائے اور ایران، عراق اور قفقاز کے تیل کے چشموں پر قبضہ کر لیا جائے۔ ۴۱ء کے آخر میں سوویت اور برطانیہ دونوں نے ایران کو فاشسٹ فتنے سے پاک کرنے کے لیے اپنی فوجیں وہاں بھیجیں۔ سوویت کے اس اقدام کے بارے میں بعض حلقوں میں بہت غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے لیکن ان لوگوں کو یاد نہیں کہ ۲۶ فروری ۲۱ء کو ایران اور سوویت میں جو معاہدہ ہوا تھا اس کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر کوئی تیسری طاقت سوویت پر حملہ کرنے کی غرض سے ایران کو اپنا مرکز بنانا چاہے تو سوویت فوجوں کو عارضی طور سے ایران میں داخل ہونے کا اختیار ہوگا۔ سرخ فوجیں جنوری ۴۲ء میں ایران میں اسی معاہدے کے مطابق داخل ہوئیں اور ۲۰ جنوری ۴۲ء کو ایرانی حکومت سوویت اور برطانیہ میں ایک معاہدہ ہوا جس میں طے پایا کہ اتحادی طاقتیں (سوویت اور برطانیہ) ایران کے تمام موجودہ رقبے کی سالمیت اور سیاسی آزادی کا احترام کریں گی، وہ ایران کو بیرونی حملے سے بچائیں گی، جنگ ختم ہونے پر چھ مہینے کے اندر اندر وہ اپنی تمام فوجیں ایران سے ہٹائیں گی، اتحادی فوجوں کے تمام مصارف اتحادی حکومتیں برداشت کریں گی اور ایران کے اندرونی معاملات میں انہیں مداخلت کا حق نہ ہوگا۔ اگر اس

معاہدے کا مقابلہ زارروس اور برطانوی سامراج کے ۱۹۰۷ء کے اس خفیہ معاہدے سے کیا جائے جس کی رو سے روسی اور برطانوی سامراج نے ایران کو اپنے اپنے 'حلقۂ اثر' میں بانٹ لیا تھا تو سوویت یونین کی بیرونی پالیسی صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ سوویت یونین ہی کی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ آج ایران میں جمہوری حکومت قائم ہے اور وہ سامراج کی دست بُرد سے بچا ہوا ہے۔ اس معاہدے میں ایران کی سالمیت اور استقلال کی بھی ضمانت دی گئی کہ ایران کے حصے بخرے نہ ہوں۔ سرخ فوج ایران میں ایرانی قوم کی آزادی اور سالمیت کی سب سے بڑی محافظ ثابت ہو رہی ہے۔

آج سوویت یونین کی فوجیں نازیوں کو زک پر زک دے رہی ہیں، ان کا ہر قدم نازیوں کو اسلامی ملکوں اور ہندوستان سے دور کر رہا ہے اور ان کی ہر فتح ترکی، ایران اور افغانستان کی آزادی اور خودمختاری کو تقویت پہنچاتی اور انہیں فاشسٹ تباہ نا کیوں سے بچاتی ہے۔

مارکس اور مشرق معروف ترقی پسند ادیب اور اشتراکی مفکر سید سبط حسن کی زندگی کے آخری زمانے کی تصانیف میں سے ایک ہے۔ اس کتاب کی تصنیف ان کی دیرینہ خواہش رہی اور اس کے لیے انھوں نے کئی سال محنت بھی کی، مختلف لائبریریوں سے مواد اکٹھا کیا اور بہت مفصّل نوٹس بھی تیار کیے۔ بدقسمتی سے کتاب کی تصنیف کا کام ابھی ان کے حسبِ منشا مکمل نہیں ہوا تھا اور ابھی وہ اس کے صرف پانچ ابواب مکمل کر پائے تھے کہ ان کی زندگی کا آفتاب غروب ہو گیا۔ اب ان کے انہیں مکمل شدہ ابواب کو ضروری تدوین و ادارت کے بعد اس کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کتاب کے موضوع یعنی مارکس، اشتراکیت اور اقوام مشرق پر ان کے اثرات کی مناسبت سے سبط حسن صاحب کی بعض دوسری نادر تحریریں بھی جو مختلف اوقات میں لکھی گئیں، اس کتاب کے حصہ دوم میں محفوظ کر لی گئی ہیں۔ امید ہے کہ سبط حسن صاحب کی دوسری کتابوں نے سماجی و سیاسی شعور کو ترقی دینے اور روشن خیالی اور سائنسی طرزِ فکر کے فروغ میں جو کردار ادا کیا ہے وہی کردار ان کی یہ یادگار کتاب بھی ادا کرے گی۔

اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر سید جعفر احمد نے موجودہ کتاب کے علاوہ سبطِ حسن مرحوم کی تین اور کتابیں 'افکارِ تازہ'، 'ادب اور روشن خیالی' اور 'مغنیِ آتش نفس، سجاد ظہیر' بھی مرتب کی ہیں۔ ڈاکٹر سید جعفر احمد کراچی یونیورسٹی کے پاکستان اسٹڈی سینٹر سے وابستہ ہیں جہاں وہ سیاسیات و تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے تدریس و تحقیق کی ذمے داریاں سرانجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم۔ اے اور پاکستان اسٹڈیز میں ایم۔ فل کرنے کے بعد برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی سے سماجی و سیاسی علوم میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا ہے۔ سیاسیات، تاریخ، تعلیم، حقوقِ انسانی اور امن کے موضوعات پر انگریزی اور اردو میں ان کی کئی کتابیں اور مقالات شائع ہو چکے ہیں۔